جلد ۱۳۷　ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۶ء　عدد ۲

مضامین

شذرات

اجودھیا کی بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا، ہندوؤں نے خوشی میں چراغاں کیا اور مسلمانوں نے اپنے غم و غصہ کے اظہار میں گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرائے اور بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔

ملک اور خصوصاً اتر پردیش میں اس سے ہندو مسلمانوں میں جو کشیدگی پیدا ہو گئی ہے، اس سے ان سطروں میں بحث نہیں، اس واقعہ پر یو۔پی کے مشہور اخبار "پائنیر کی چار اشاعتوں میں ۹ فروری ۱۹۸۶ء میں جو ایک مضمون شایع ہوا ہے، اسی پر ایک نظر ڈالنی ہے، اس کی جلی سرخیاں بظاہر صلح کل انداز کی ہیں، مگر اس میں جو تاریخی واقعات تاریخوں کے حوالے سے قلمبند کیے گئے ہیں، اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے، تاکہ اس سے جو تاریخی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ دور ہو جائیں، کالم نگار کا بیان ہے کہ مغل شہنشاہ بابر نے رام جنم بھومی کو ۱۵۲۸ء میں بابری مسجد میں بدل دیا، لیکن ایسا کرنے میں اس کو ہندوؤں کی پانچ شرطیں منظور کرنی پڑیں، جیسا کہ توجک بابری" کے صفحہ ۵۳۲ پر ہے۔ (پانیر ۱۱ر فروری، ص ۱)

مغل بادشاہوں کے عہد میں توجک بابری کے نام سے تو کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اگر اس سے مراد تزک بابری ہے تو اس کتاب کے صفحہ ۵۳۲ کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ معلوم نہیں کون سی تزک بابری کا ہے، یہ ترکی زبان میں قلمبند ہوئی، جو کسی بھی ہندوستانی مورخ کے دسترس سے باہر ہے، اس کا ترجمہ فارسی میں اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں نے کیا، جو اب تک نہیں چھپا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج نے کیا جس کا نام اس نے "دی بابر نامہ ان انگلش" رکھا، اس کا ترجمہ اردو میں بھی تزک بابری اور دو معروف بابر نامہ کے نام سے ہوا۔

"کالم نگار" نے اگر تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے تو میرے سامنے اس کی پہلی اور

دوسری جلدیں ہیں، جو ۱۹۲۲ء میں چھپیں، اور یہی علمی حلقہ میں پڑھی جاتی ہیں، اس کے ۵۳۲ صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں جو کالم نگار نے لکھی ہیں، انگریزی ترجمہ کرتے وقت اس میں ترکی نسخہ کے صفحات بھی درج کر دیے گئے ہیں، جو ۳۸۲ پر ختم ہو جاتے ہیں، اردو ترجمہ ۳۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو نہیں معلوم کہ اس کا ہندی میں ترجمہ ہوا ہے کہ نہیں، کالم نگار کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ آخر کس تزک بابری کا وہ حوالہ دے رہے ہیں، ہم ہندوستان کے مورخین اور محققین کی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھوں نے تزک بابری کے ص ۵۳۲ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اور اگر صحیح ہے تو وہ بتائیں کہ کون سی تزک بابری کا یہ حوالہ ہے؟

کالم نگار نے اپنے ناظرین کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کر کے بابر نے مسجد کیسے بنائی؟ ان کا بیان ہے کہ بابر نے رانا سانگا سے پہلی جنگ آگرہ کے پاس فتح پور سیکری میں کی، اس وقت اودے پور کی سلطنت اجودھیا تک پھیلی ہوئی تھی، اس پہلی جنگ میں وہ شکست کھا گیا تو بھاگ کر اجودھیا چلا آیا، یہاں آکر وہ دو مسلم صوفی بزرگوں جلال شاہ اور خواجہ کجل عباس قلندری موسیٰ عاشکان (عاشقان) سے ملا، اول الذکر بزرگ نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں، جس کے بعد بابر نے فتح پور سیکری کی دوسری لڑائی جیت لی، وہ اجودھیا آیا، جلال شاہ کی دعاؤں کا صلہ دے کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا تو جلال شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ رام جنم بھومی گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، بابر نے ان کی خواہش پوری کی۔

کالم نگار نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ خواجہ کجل عباس (قزلباش) اور جلال شاہ دونوں مہاتما شیام نند جی کے چیلے تھے، اس وقت رام جنم بھومی کا نظم و نسق ان ہی کے سپرد تھا، یہ دونوں اپنے گرو کے آشیربادوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے، اور وہ مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے،

جلال شاہ نے بابر سے کہا کہ رام جنم بھومی مندر ایک پوتر اور اوتاری جگہ ہے، اس کی جگہ پر ایک چھوٹا سا شہر آباد کرکے مسلمانوں کے لیے ایک "خورد مکہ" بنایا جائے، بابر نے اپنے فوجی سردار میر بانکی (؟) کو حکم دیا کہ اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، میر بانکی (؟) نے حکم کی تعمیل شروع کی، مگر مسجد کے لیے دن میں جو دیوار اٹھائی جاتی وہ رات میں گر جاتی، میر بانکی (؟) نے بابر کو اجودھیا آنے کی دعوت دی، تاریخ میں ہے کہ بابر نے یہاں آکر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی پانچ باتیں منظور کرلیں، جیسا کہ توجک بابری (تزک بابری) میں لکھا ہے۔

جو باتیں بابر نے منظور کیں وہ یہ تھیں: (۱) مسجد کا نام سیتا پاک ہوگا (۲) اس میں مینار نہیں ہوگا (۳) مسجد یعنی رام جنم بھومی کے پاس ہندوؤں کے لیے پری کرما بھی بنایا جائے (۴) اس کا بڑا پھاٹک صندل کا ہو (۵) ہندوؤں اور مہاتماؤں کو اس کے اندر پوجا کی آزادی ہو اور مسلمان اس میں صرف جمعہ کی نماز پڑھیں، کالم نگار یہ بھی لکھتا ہے کہ رام جنم بھومی کی خصوصی محراب پر فارسی کے کتبے ہیں، اور کچھ منا (؟) زبان میں بھی ہیں، ان دونوں سے ظاہر ہے کہ یہ سیتا پاک ہے، اس کا شمالی حصہ پھر سے بنایا گیا، اور اب تک سیتا پاک کے نام سے مشہور ہے۔

کالم نگار کے بیان کے مطابق یہ ساری باتیں تزک بابری میں درج ہیں، وہ تزک بابری کے ان صفحات کی نشاندہی کریں جہاں سے یہ ساری تفصیلات لی گئی ہیں، ورنہ ہندوستان کے سارے مورخوں کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں، جن کا تعلق نہ تزک بابری اور نہ کسی مستند تاریخ سے ہے، یہ کہنا صحیح نہیں کہ بابر اور رانا سانگا کی لڑائیاں فتح پور سیکری میں ہوئیں، یہ بھی درست نہیں کہ یہاں دو لڑائیاں لڑی گئیں، صرف ایک لڑائی کنواہہ کے میدان میں ہوئی، جس میں بابر کامیاب رہا، اور اس بات میں افسانویت ہے کہ بابر پہلی جنگ میں ہار تو اجودھیا آیا، اور پھر یہاں کے بزرگوں کی دعائیں لے کر گیا تو کامیاب رہا، اور پھر واپس

آیا تو مسجد بنائی، اور پھر ہندوؤں سے سمجھوتہ کیا، تزک بابری میں بابر نے اپنی زندگی کے تمام جزدی واقعات لکھے ہیں، اتنے اہم واقعہ اور سمجھوتہ کو کیسے نظرانداز کرسکتا تھا، وہ اودھ ضرور آیا، مگر وہ پورب کے افغان سرکشوں کو صرف دبانے کے لیے یہاں پہونچا، وہ اس سلسلہ میں چین تیمور سلطان، شیخ بایزید ترددی بیگ، نوچ بیگ، باباجہرہ، باقی شقاول، لکھنؤ، گومتی، گھاگرا اور سرد وغیرہ کا تو ذکر کرتا ہے، مگر رام جنم بھومی، جلال شاہ اور خواجہ کجل شاہ کے نام تک نہیں لیتا، (ترجمہ تزک بابری، اردو، ص ۳۰ - ۳۲۹، بابرنامہ از اے، ایس بیورج ص ۶۰۲ - ۶۰۱، ۱۹۲۲ء ایڈیشن) بابر یہاں مسلمانوں ہی سے لڑنے آیا تھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ علاقے ان کے زیرنگیں تھے، پھر معلوم نہیں کالم نگار نے یہ کیسے دعویٰ کیا ہے کہ اجودھیا تک رانا سانگا کی حکومت تھی۔

ابوالفضل کی اکبرنامہ، ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، خافی خان کی منتخب اللباب، سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ، یا مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں ہے، الیٹ اینڈ ڈاوسن کی ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ میں تزک بابری کے کچھ اقتباسات ہیں، یہ دونوں مورخین مسلمانوں کی مندر شکنی کے واقعات کی تلاش میں رہتے ہیں، انھوں نے بھی تزک بابری کے اقتباسات میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں کیا ہے، ولیم ارسکن اور راشبروک ولیم نے بابر پر دو کتابیں لکھی ہیں، جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں، ان میں بھی اس انہدام کا ذکر نہیں۔

اے - ایس - بیورج نے تزک بابری کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا اس میں اس نے بڑی محنت سے حواشی، ضمیمہ جات اور تعلیقات لکھے ہیں، جن میں رام جنم بھومی مندر کے انہدام کا ذکر مطلق نہیں ہے، اور نہ جلال شاہ، خواجہ کجل شاہ اور ہندوؤں سے بابر کے سمجھوتے کا ذکر ہے، البتہ اس کی دوسری جلد میں "اجودھیا (اودھ) میں بابر کی مسجد کے کتبات" کے عنوان سے ایک

ضمیمہ ہے، اس میں پہلے تو یہ تین اشعار نقل کیے گئے ہیں :

بفرمودہ شاہ بابر کہ عدلش
بنا یست تا کاخِ گردوں ملاقی

بنا کرد ایں ہبطِ قدسیاں را
امیر سعادت نشاں میر باقی

بود خیر باقی چو سالِ بنایش
عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی (۹۳۵ھ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ بابر کے حکم سے جس کی عدل پروری کاخِ گردوں سے ملتی ہے، اس کی بنا پڑی، امیر سعادت نشان میر باقی نے اس کو بنوایا، جو اب فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے، خدا کرے یہ کار خیر باقی رہے، اسی لیے اس کی تعمیر کا سال "بود خیر باقی" (۹۳۵ھ) ہے۔

دوسرے کتبہ میں یہ تین اشعار ہیں :

بنامِ آں کہ دانا ہست اکبر
کہ خالق جملہ عالم لامکانی

درودِ مصطفیٰ بعد از ستایش
کہ سرورِ انبیائے دو جہانی

فسانہ در جہاں بابر قلندر
کہ شد در دورِ گیتی کامرانی

ان اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کو دانا، اکبر، جملہ عالم کا خالق اور لامکان کہا گیا ہے، پھر اس حمد کے بعد محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجا گیا ہے، اور آپؐ کو دونوں جہان کی انبیائی کا سردار کہا گیا ہے، پھر آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ بابر قلندر کا افسانہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے کہ وہ اس دنیا میں کامران رہے۔

اے۔ ایس۔ بیورج نے ان اشعار کی لفظی خوبیوں پر پورا تبصرہ کیا ہے، مگر کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر بنائی گئی ہے، اور نہ پانیر کے کالم نگار کے بیان کے مطابق ان کتبوں میں کہیں سیتا پاک لکھا ہوا ہے۔

پانیر کے کالم نگار نے لکھا ہے کہ بابر کی مسجد ۱۵۲۸ء میں رام جنم بھومی مندر کو منہدم کرا کے بنائی گئی

ڈاکٹر راجندر پرساد سابق صدر جمہوریہ نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ڈی وائڈڈ میں بابر کا وہ وصیت نامہ نقل کیا ہے جو اس نے اسی سال ہمایوں کے لیے لکھ کر چھوڑ رکھا تھا، اور وہ یہ ہے :-

"اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوحِ دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اسی سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلافات کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ، جس طرح کہ انسانی جسم ملا رہتا ہے، تاکہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے"

یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ (انڈیا ڈی وائڈڈ، ص ۳۹، تیسرا ایڈیشن)

یہ تحریر اسی سال کی ہے جس میں "پانیر کے کالم نگار" کے بیان کے مطابق رام جنم بھومی مندر کا انہدام ہوا، بابر کی اس رواداری اور فراخ دلی کے بعد کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک مندر کو منہدم کرنے کے بعد ایک مسجد بنوا دی، پروفیسر شری رام شرما کی کتاب "مغل امپائر ان انڈیا" کی جلد اول کے ص ۵۴- ۵۵ پر بھی بابر کا یہ وصیت نامہ درج ہے، اسی لیے پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا، یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لیے کی کہ وہ

ہند ہے۔ (ایضاً، ص ۵۵، سنہ ۱۹۴۵ء ایڈیشن)

پائنیر کے کالم نگار نے "دیوان اکبری" کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکبر نے بیربل اور ٹوڈرمل کو بھیج کر ہندوؤں کے سادھوؤں اور مہاتماؤں سے یہ سمجھوتہ کیا کہ وہ مسجد کے بائیں جانب ایک چبوترہ بنالیں جو رام مندر کہلائے گا، یہ ہندوؤں کے پوجا اور درشن کے لیے ہوگا، اکبر کو ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ ہندوؤں نے کم سے کم بیس[20] مرتبہ اس پر حملے کیے تھے، جیسا کہ دیوان اکبری سے ظاہر ہے، اکبر کے زمانہ میں دیوان اکبری کے نام سے کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی، اگر اس سے آئین اکبری مراد ہے تو ہم پھر ہندوستان کے مورخوں کی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئین اکبری کے کسی صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں، اس میں اودھ یعنی اجودھیا کے ذکر میں جہاں اور باتیں ہیں، اس کے مذہبی تقدس کا ذکر صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کی بڑی اور قدیم تیرتھ گاہ ہے، سواد شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے، یہ شہر رام چندر کا مسکن تھا، رام چندر، ترپتا دور کے ظاہری و باطنی ہر دو عالم کے مشہور معنوی اور صوری فرماں روا گذرے ہیں، (آئین اکبری، نول کشور پریس ایڈیشن، جلد دوم ص ۸۰)

پائنیر کے کالم نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے رام مندر کو ساتویں رمضان کو بالکل منہدم کر دیا، اس کے لیے عالمگیر نامہ ص ۶۳۰ کا حوالہ دیا ہے، میرے سامنے عالمگیر نامہ ہے جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شایع ہوئی ہے، یقین کامل کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے صفحہ ۶۳۰ پر ایسی کوئی تحریر نہیں لکھی ہوئی ہے، اور نہ اس کے کسی اور صفحہ پر اس چبوترہ کے انہدام کا ذکر ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے (جس کو کالم نگار نے میر بانکی لکھا ہے) اجودھیا میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوا دی تھی، جس کا تعلق رام جنم بھومی کے انہدام سے کچھ بھی نہیں، اس مسجد پر قبضہ کرنے میں سیاسی استحصال کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، مگر اس رنگ کو پیدا کرنے میں غلط قسم کی تحقیقات اور تعبیرات سے ہندوستان کے علم، تحقیق اور تاریخ کے معیار کو بدنام نہ کیا جائے۔

مقالات

امام اشعری اور مستشرقین

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب استاذ مدرسہ عالیہ رامپور

یہ مضمون نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۵۶ء اور جنوری سنہ ۱۹۵۷ء کے معارف میں تین قسطوں میں شائع ہو چکا تھا لیکن اس سلسلہ کے جو مضامین معارف میں شائع ہو رہے ہیں، ان میں اس مضمون کی اہمیت اور افادیت کی خاطر اس کو شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ("معارف")

مستشرقین کی علمی خدمات اپنی جگہ پر قابل صد ستایش ہیں، مگر دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر سے اوجھل نہ رہے، یہ صحیح ہے کہ ان کی سعی و کاوش کے طفیل میں مشرق کے بہت سے علمی نوادر جو نقش و نگار طاقِ نسیاں بن چکے تھے، از سر نو اجاگر ہو گئے، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی تحقیق کے پردے میں بسا اوقات انتہائی خطرناک مقصد پنہاں رہتا ہے، وہ اسلامی تاریخ کے غیر اہم اور دھندلے نقوش کو بھی اپنے مخصوص سیاسی مقاصد کے پیش نظر نمایاں کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، شعوبیہ کی تحریک کوئی اہم اجتماعی تحریک نہیں تھی، صرف ایک ادبی تحریک تھی، جو چند اہل ادب تک محدود رہی، اور طبقۂ عوام اس سے آشنا بھی نہیں ہوا، مگر مسٹر براؤن نے جن کا شمار اسلامیات کے محسنین کی صف اول میں ہوتا ہے، اپنے قلم کی چابک دستی سے اس کو وہ شوخ رنگ بخشا جس نے ایران و توران اور

ترک وعرب کی تفریق کو زندہ کر دیا۔

نقاشانِ فرنگ نے اس قسم کے دھندلے نقوش ہی کو نمایاں کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ایسے ایسے افسانے تراشے جن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا، اسلامی شریعت وفقہ تمام تر قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، مگر گولڈزیہر نے یہ افسانہ تراشا کہ اسلامی فقہ رومن قانون سے ماخوذ ہے، اس افسانہ نے آگے چل کر ایک امر واقعہ کی حیثیت حاصل کر لی اور آج ایک جماعت کا جس نے محمڈن لا کا مطالعہ انگریزی کتابوں کی مدد کیا ہے خیال ہے، کہ اسلامی فقہ بڑی حد تک رومن لا سے متاثر ہوئی ہے۔

اس لیے حزم واحتیاط کا مقتضا ہے، کہ مستشرقین کی علمی وتحقیقی کاوشوں کو آنکھ بند کر کے نہ مان لیا جائے ہماری خوش فہمی ملاحظہ ہو کہ ہم مستشرقین کی ہر علمی کوشش کو بڑی فراخدلی سے احسنت ومرحبا کہنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

حال ہی میں ایک امریکن مشنری رچرڈ جوزف مکارتھی نے "الاشعری کی دینیات" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، جو باوجود کوشش کے میرے مطالعہ میں نہ آسکی، جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار رامپوری نے معارف اکتوبر ۱۹۵۵ء میں اس کا تعارف کرایا ہے، اس کی روشنی میں اس کتاب کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

"الاشعری کی دینیات" امام اشعری کی کتاب اللمع اور استحسان الخوض فی الکلام کے عربی متون اور انگریزی تراجم پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ چار ضمیمے بھی ہیں، جن میں سے ایک ضمیمہ میں امام اشعری کی تصانیف کی فہرست ہے۔

جہاں تک کتاب اللمع کی اشاعت کا تعلق ہے، ہم مسٹر مکارتھی کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے اس اہم کتاب کو شائع کر کے ایک بڑے مفکر اسلام کے افکار عالیہ سے براہ راست آشنا ہونے کا ہم کو موقع دیا ہے۔

مسٹر مکارتھی نے کتاب "اللمع" امریکی یونیورسٹی بیروت کے قلمی نسخہ کی مدد سے شائع کی ہے معلوم نہیں اس کی تصحیح ومقابلہ میں انھوں نے اس نسخہ کے علاوہ دوسرے نسخوں سے بھی مدد لی ہے، یا نہیں، اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے، جس کی نشاندہی بروکلمن نے اپنی "تاریخ الادب العربی" میں کی ہے[1]، ابتدا سے بدعتی فرقوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اکابر علمائے اہلسنت والجماعت کی کتابوں میں ایسی چیزوں کا اضافہ کر دیتے ہیں، جن سے ان بزرگوں کا دامن پاک تھا، اس لیے علماء نے کسی کتاب کے قابل اعتماد ہونے کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ ثقہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہ چکی ہو، چنانچہ ریٹر نے امام اشعری کی کتاب "مقالات الاسلامیین" جن نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کی ہے، اُن میں سے ایک نسخہ شہرستانی کے استعمال میں رہ چکا ہے[2]۔

دوسری شرط یہ رکھی تھی کہ کتاب کی مسلسل روایت مصنف تک ثابت ہو لیکن یہ شرط اس زمانہ میں پوری نہیں ہو سکتی، اس لیے اس کے بجائے یہ شرط ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ اس کتاب کے مباحث کی تائید دوسری مشہور ومستند اول کتابوں سے ہوتی ہو، چنانچہ ریٹر نے "مقالات الاسلامیین" کے مباحث کی تائید میں ملل ونحل کی دوسری کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔

معلوم نہیں مسٹر مکارتھی نے ان شرائط کا کہاں تک لحاظ رکھا ہے، اس کے بغیر اس قسم کی کتابوں کی صحت مشکوک ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے امام اشعری کی "الابانہ عن اصول الدیانۃ" جو دائرۃ المعارف حیدرآباد سے پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ اور دوبارہ ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوئی ہے، اہل نظر کے نزدیک مشکوک الصحت ہے، چنانچہ استاذ الکوثری نے تبیین کذب المفتری پر اپنی تعلیقات میں لکھا ہے۔

والنسخۃ المطبوعۃ فی الھند من الابانہ نسخۃ مصحفۃ محرفۃ

تلاعبت بھا الایادی الاثیمہ فیجب اعادۃ طبعھا من

---

[1] بروکلمن تاریخ الادب العربی ملحق جلد اول صفحہ ۳۴۵ رقم ۳ و ضمیمہ فہرست برٹش میوزیم صفحہ ۲، پر اس کتاب کا ذکر ہے) [2] مقالات الاسلامیین جلد اول مقدمہ ناشر ص ۵۔

اصل وثیق ہے۔[۱]

یہ اس کتاب کا حال ہے۔ جو ایک مسلمان ادارے اور ایک مسلمان مطبع سے مسلمان مصححین کی نگرانی میں شائع ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کتاب کے متعلق قارئین کرام خود اندازہ لگا سکتے ہیں جو ایک امریکن مشنری نے ایک مسیحی کتب خانہ کے مخطوطہ کی مدد سے ایک مسیحی یونیورسٹی کے زیر سرپرستی ایک کیتھولک پریس سے شائع کی ہے، ہم کسی کی نیت پر حملہ نہیں کرتے ہیں لیکن کسی کتاب کی صحت کے لیے ناشرین کی نیک نیتی بھی شرط ہے، جس کی توقع ایک مشنری اور ایک کیتھولک پریس سے نہیں کی جا سکتی ہے۔

گلستان میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیخ سعدی ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، اس کا پڑوسی ایک یہودی تھا، اس نے اس مکان کی بہت زیادہ تعریف کی، شیخ سعدی نے سب کچھ سنکر کہا کہ جی ہاں، اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ آپ کی ہمسائیگی سے سابقہ پڑے گا! یہی حال مستشرقین کی شائع کردہ کتابوں کا بھی ہے۔

الاشعری کی "دینیات" کا سب سے زیادہ قابل قدر حصہ اس کے مداحین کی نظر میں کتاب کا وہ ضمیمہ ہے جس میں امام اشعری کی تصانیف کی فہرست دی گئی ہے، لیکن مجھے مسٹر مکارتھی کی مرتبہ فہرست میں کوئی خاص ندرت نظر نہیں آئی، امام ابوالحسن الاشعری کی تصانیف کی تعداد دو تین سو کے قریب ہے، جیسا کہ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں روایت کیا ہے۔

اخبرنی الشیخ ابوالقاسم بن نصر	مجھ سے شیخ ابوالقاسم بن نصر الواعظ نے اپنی
الواعظ فی کتابہ عن ابی المعالی	کتاب میں جسے ابی المعالی بن عبد الملک
بن عبد الملک القاضی قال سمعت	القاضی سے روایت کیا ہے خبر دی کہ انھوں نے

[۱] تبیین کذب المفتری ص ۸ حاشیہ۔ ابانہ کا جو نسخہ ہندوستان میں چھپا ہے، وہ ایک ایسے نسخہ سے چھاپا گیا ہے جس میں بہت زیادہ تصحیف و تحریف ہوگئی ہے اس لیے اسے دوبارہ ایک قابل اعتماد نسخہ سے شائع کرنا ضروری ہے۔

من اثق بہ قال رأیت تراجم	کہا کہ میں نے ایک قابل اعتماد شخص سے سنا
کتب الامام ابی الحسن الاشعری	کہ میں نے امام ابی الحسن الاشعری کے تراجم کتب
فعددتها اکثر من مائتین و	کو گنا تو وہ دو تین سو سے زائد تھے
وثلثمائة مصنف[۱]	

ان میں سے مسٹر مکارتھی نے ایک سو چھ کتابوں کی فہرست دی ہے، حالانکہ ایک سو پانچ کتابوں کے نام حافظ ابن عساکر نے تبیین کذب المفتری میں بتفصیل ذیل نقل کیے ہیں۔

(۱) بہتر کتابوں کے نام وہ ہیں جو ابن فورک نے امام اشعری کی کتاب العمد سے نقل کیے ہیں اور جو امام صاحب نے ۳۲۰ھ تک تصنیف کی تھیں[۲]۔

(۲) اٹھائیس کتابوں کے نام "العمد" کے حوالے کے علاوہ ابن فورک سے حافظ ابن عساکر نے نقل کیے ہیں، جو امام صاحب نے ۳۲۰ھ کے بعد تصنیف کی تھیں[۳]۔

(۳) تین کتابوں کے نام حافظ ابن عساکر کی اپنی دریافت ہیں[۴]۔

(۴) ایک کتاب "کشف الاسرار وہتک الاستار" کا ذکر انھوں نے اس مقام پر کیا ہے، جہاں امام صاحب کے اعتزال سے تائب ہونے کا واقعہ نقل کیا ہے۔

[۱] تبیین ص ۱۳۶، اس روایت کے بارہ میں یہ کہنا کہ ممکن ہے، اس میں کچھ مبالغہ ہو، صحیح نہیں ہے، ایک سو کتابوں کے نام تو ابن فورک نے گنائے ہیں، ان کے علاوہ اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں، خود ابن فورک نے کہا ہے۔ یہ ان کتابوں کے نام ہیں جو امام اشعری نے ۳۲۰ھ تک تصنیف کی تھیں، لوگوں کو جو لیکچر (امالی) لکھائے یا لوگوں نے مختلف مقامات سے ان کے پاس سوالات بھیجے تھے، اور جن کے انھوں نے جوابات دیے ہیں، ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے: تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱-۳ اور یہ ظاہر ہے کہ امالی و فتاوی کی تعداد مستقل اور باضابطہ کتابوں سے کہیں زیادہ ہوا کرتی ہے، اس طرح امام اشعری کی تصانیف کا دو تین سو ہونا مستبعد نہیں بلکہ قرین قیاس ہے۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰ پر)

ودفع الکتاب الی الناس فمنها "کتاب اللمع" وکتاب اظهر فیه عوارض المعتزلة سماه بکتاب کشف الاسرار وهتك الاستار[1].	اور لوگوں کو اپنی کتابیں دیکھنے کے لیے دیں، ان میں سے ایک کتاب اللمع تھی اور ایک دوسری کتاب تھی، جس میں معتزلہ کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا تھا، اور اس کتاب کا نام کشف الاسرار وہتک الاستار تھا۔

(۵) ایک اور کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" کا ذکر انھوں نے تبیین کذب المفتری کے آخر میں کیا ہے، کہ امام ابوعثمان الصابونی جب درس کے لیے تشریف لیجاتے تو الابانہ ان کے ہاتھ میں ہوتی۔

ان الامام اباعثمان اسماعیل بن عبد الرحمن الصابونی النیسابوری قال ماکان یخرج الی مجلس درسه الاوبیده کتاب الابانة لابی الحسن الاشعری ویظهر الاعجاب به[2].	امام ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمن الصابونی النیساپوری جب اپنے حلقہ درس میں تشریف لے جاتے تو امام اشعری کی الابانہ ان کے ہاتھ میں ضرور ہوتی۔ اور وہ اس کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتے تھے۔

اس طرح حافظ ابن عساکر نے امام اشعری کی ایک سو پانچ کتابوں کے نام نقل کیے ہیں، ان کے علاوہ مسٹر مکارتھی کی فہرست میں صرف پانچ کتابیں ایسی رہ جاتی ہیں، جن کا ذکر تبیین کذب المفتری میں نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) [3] مسٹر مکارتھی نے صرف ۹۶ کتابیں گنائی ہیں لیکن نمبر ۱۲ اور ۹۴ دو دو کتابیں ہیں، ایک نے اعتزال کی تصنیف اور ایک اعتزال سے تائب ہوجانے کے بعد کی ایک کتاب "کتاب فی مقالات الفلاسفة خاصة" کا ذکر ہی نہیں کیا، اسی طرح اس ضمن میں ۸۸ کتابیں ہوتی ہیں [4] مسٹر مکارتھی نے صرف ۲۶ کتابیں گنائی ہیں لیکن نمبر ۸۳ اور نمبر ۸۰ دو دو کتابیں ہیں، اس کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی، اس طرح اس ضمن میں اٹھائیس کتابیں آتی ہیں [5] تبیین ص ۱۳۵

[1] تبیین ص ۱۰۲ سطر ۱۹۔ مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۴۰، [2] تبیین ص ۳۸۹ مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۱۰۔

اور جن کی دریافت کا سہرا مستشرقین کے سر بتایا جاتا ہے، ان کی نوعیت یہ ہے۔

۱۔ کتاب التبیین عن اصول الدین:۔ اس کا نام ابن الندیم نے الفہرست میں دیا ہے، مگر خود مسٹر مکارتھی کا خیال ہے، کہ "ہوسکتا ہے کہ یہ ابانہ ہو"۔ اور یہ قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ "الابانہ عن اصول الدیانہ" اور کتاب "التبیین عن اصول الدین" کا مفہوم ایک ہی ہے، اس لیے یہ ابن عساکر پر کوئی نیا اضافہ نہیں ہے۔

۲۔ رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام:۔ (مطبوعہ ۱۳۲۳ھ ۱۳۴۴ھ) غالباً یہ رسالہ الحث علی البحث ہے[1]، کیونکہ استحسان الخوض فی علم الکلام اور الحث علی البحث کا ماحصل ایک ہی ہے۔

۳۔ رسالہ کتب بہا الی اہل الثغر بباب الابواب:۔ اسے قوام الدین بک نے جامعہ استنبول سے شائع کیا ہے[2]، غالباً یہی کتاب ہے جس کا نام ابن عساکر نے "جواب مسائل کتب بہا الی اہل الثغر فی تبیین ما سئلوا عنہ من مذہب اہل الحق" بتایا ہے، کتابوں کے تسمیہ میں اس قسم کے اختلافات قدماء کے یہاں عام ہیں۔

چنانچہ ریٹر کی نشر کردہ "مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین" کا نام تبیین میں "کتاب فی مقالات المسلمین یستوعب جمیع اختلافاتہم ومقالاتہم" ہے، لیکن مقالات الاسلامیین کے پانچ مخطوطات کے نام جن کی مدد سے ریٹر نے اسے اڈٹ کیا ہے، حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جامع ایاصوفیا کے قدیم نسخہ کا نام ہے، کتاب مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین۔

ب۔ جامع ایاصوفیا کے دوسرے نسخہ کا نام ہے "کتاب مقالات الاسلامیہ"۔

ج۔ پیرس کی قومی لائبریری کے نسخہ پر کوئی نام نہیں ہے، کیونکہ وہ اول میں ناقص ہے۔

د۔ حیدرآباد کے نسخہ کے صفحہ عنوان پر "الجزء الاول من مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین" مرقوم ہے، لیکن خاتمۂ کتاب پر "کتاب المقالات والاختلاف" لکھا ہے۔

[1] تبیین ص ۳۸۹ مکارتھی کی فہرست میں نمبر ۱۰۵ [2] مقالات الاسلامیین ج اول مقدمۂ ناشر۔

۴۔ خواجہ اسماعیل آفندی کے نسخہ کے آخر میں اس کا نام "الملل والنحل غیر الملل والنحل الذی للشہرستانی بل لغیرہ من الافاضل" لکھا ہے، یہ کتاب حافظ ابن تیمیہؒ کے پیش نظر رہی ہے، مگر انھوں نے ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ اسے موسوم نہیں کیا، چنانچہ منہاج السنۃ میں لکھا ہے۔

ومن اجمع الکتب التی رأیتھا فی مقالات الناس المختلفین فی اصول الدین کتاب ابی الحسن الاشعری۔[1]	اصول الدین میں مختلف لوگوں کے مقالات میں جامع ترین کتاب جو میں نے دیکھی ہے، وہ ابی الحسن الاشعری کی ہے۔

ان تصریحات کے بعد بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک ہی کتاب کے مختلف نام ہوا کرتے تھے، اس لیے یہ تینوں کتابیں بالترتیب مسٹر مکارتھی کی فہرست کی نمبر ۵۰۱، نمبر ۹۷ اور نمبر ۹۹ ہیں اور اس لیے انھیں کوئی نیا اضافہ نہیں سمجھا جاسکتا۔

۴۔ کتاب الامام :۔ یہ نام حد درجہ مبہم ہے، ہر کتاب کے متعلق کتاب الامام کہا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی مصنف نے کہیں معہود ذہنی کے طور پر امام اشعری کی کتاب کا (جو غالباً ابن عساکر کی فہرست میں محسوب ہوچکی ہے) کتاب الامام کے نام سے حوالہ دیا ہو۔

۵۔ قول جملہ اصحاب الحدیث واہل السنۃ فی الاعتقاد :۔ کسی مصرحہ حوالے کے بغیر اسے بھی مستقل نہیں مانا جاسکتا۔

غرض ایک سو چھ (۱۰۶) کتابوں کی فہرست میں سے جو مسٹر مکارتھی نے دی ہے، ایک سو ایک کتابیں وہ ہیں، جن کے نام حافظ ابن عساکر نے اپنی کتاب تبیین کذب المفتری میں دیے ہیں، باقی پانچ کا اضافہ جن کی دریافت کا سہرا مستشرقین کے سر ہے حد درجہ مشکوک ہے، کیونکہ ان کتابوں میں تین کتابیں نام بدل کر شائع ہوئی ہیں، جو حقیقۃً وہی ہیں، جو ابن عساکر کی فہرست میں مرقوم ہیں، اور

سلہ منہاج السنۃ ج اول ص ۷۰۔

دو کتابوں کا اضافہ کسی مصرحہ حوالے کے بغیر ناقابل تسلیم ہے۔

اس لیے ایک سو ایک کے بعد جو اضافہ ہے، وہ محض بھرتی کا ہے، اور حقیقۃً ان مستشرقین نے حافظ ابن عساکر کی فہرست پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا، لیکن اگر مستشرقین کے اضافے کو مستقل تصانیف بھی مان لیا جائے اور حافظ ابن عساکر کی فہرست سے "الابانہ عن اصول الدیانۃ" اور "کشف الاسرار وہتک الاستار" کو جن کا ذکر فہرست کتب کے علاوہ ضمناً ہوا ہے، ساقط کردیا جائے، تب بھی حافظ ابن عساکر نے کم از کم ایک سو تین کتابوں کی یکجائی فہرست تو دی ہے، اور غالباً اس ایک سو تین (حافظ ابن عساکر کی فہرست) اور ایک سو چھ (مسٹر مکارتھی کی فہرست) میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے، جو مسٹر مکارتھی کے لیے وجہ امتیاز بن سکے۔

باقی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے لیے ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ تین کتابوں کا ذکر استاد ابو منصور عبد القاہر البغدادی المتوفی سنہ ۴۲۹ھ کی کتاب الفرق بین الفرق میں ہے جو امام اشعری نے نظام معتزلی کے رد میں لکھی تھیں :۔ وشیخنا ابی الحسن الاشعری رحمہ اللہ فی تکفیر النظام ثلثۃ کتب۔[1] مگر یہ کوئی اضافہ نہیں ہے، کیونکہ ان تین مجہول الاسم کتابوں کا ذکر حافظ ابن عساکر کی فہرست میں آچکا، ایک جگہ صراحۃً "والفنا کتاباً کبیراً فی الصفات ... علی ... النظام"[2] اور متعدد جگہ اجمالاً۔

مسٹر مکارتھی نے ان کتابوں کے موضوع تحریر کیے ہیں، مگر وہ اپنے ابہام و اغلاق کی وجہ سے چیستان بن گئے ہیں، جن سے کتاب کے مباحث کے متعلق کسی رہنمائی کے بجائے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، انکی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) الفصول :۔ ملاحدہ، فلاسفہ، مادیین، حلولیین اور ان لوگوں کے رد میں جو عالم

سلہ الفرق بین الفرق ص ۱۱۵۔ اور ہمارے شیخ امام ابو الحسن الاشعری نے نظام کی تکفیر میں تین کتابیں لکھی ہیں۔

سلہ تبیین صفحہ ۱۲۹ سطر ۱۳ - ۱۵

کو ازلی مانتے ہیں۔ . . . . . [1] اصل میں ہے۔

الفصول فی الرد علی الملحدین و	الفصول ملاحدہ اور ان لوگوں کے رد میں
الخارجین عن الملة كالفلاسفة	جو اسلام سے خارج ہیں، جیسے فلاسفہ۔
والطبائعیین والدھریین	اہل الطبائع (یا مادیین)، دہریے مشب
واھل التشبیه والقائلین بقدم	اور زمانہ کو قدیم ماننے والے . . . . .
الدھر . . . . . [2]	

جن لوگوں نے تاریخ ملل اسلام کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ "اہل التشبیہ" اور "حلولیین" میں بہت بڑا فرق ہے، اول الذکر وہ فرقہ ہے، جو خالق کو مخلوق کی صفات سے متصف گردانتا ہے اور ثانی الذکر وہ جو مخلوق کو خالق کی الوہیت کا اوتار (Incamtion) مانتا ہے، اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے، چنانچہ امام عبد القاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق کے باب ثالث کی فصل ثامن میں فرمایا ہے۔

الفصل الثامن فی بیان المشبھة	آٹھویں فصل فرقہ مشبہہ کے مختلف فرقوں کے ذکر
من اصناف شتی۔ اعلموا اسعدکم	میں:- جاننا چاہیے، اللہ تعالیٰ آپ کو نیک بخت
اللہ ان المشبھة صنفان، صنف	بنائے کہ مشبہہ کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ
شبھوا ذات الباری بذات غیرہ	جو ذات باری کو غیر باری کی ذات سے تشبیہ
وصنف آخرون شبھوا صفاته	دیتے ہیں، اور دوسری قسم وہ جو اس کی صفات
بصفات غیرہ . . . . فمنھم البیانیة	کو غیر باری کی صفات سے تشبیہ دیتے ہیں،

[1] معارف صفحہ ۲۹۲، سطر ۹ (یہاں اور آئندہ معارف سے مراد معارف بابۃ اکتوبر ۱۹۵۵ء ہی)

[2] تبیین صفحہ ۱۲۵، سطر ۱۶-۱۸۔

اتباع بیان بن سمعان الذی زعم	. . . . . . ان میں سے ایک بیانیہ ہیں جو بیان
ان معبودہ انسان من نور علی	ابن سمعان کے متبع ہیں جو گمان کرتا تھا کہ اسکا
صورة الانسان فی اعضائه	معبود نور کا انسان بشکل انسانی ہے، تمام اعضا
وانه یفنی کله الا وجھه	ہیں اور وہ سوائے چہرے کے سب فنا ہو جائیگا
ومنھم المغیریة . . . . زعموا ان	. . . . اور ان میں سے ایک مغیریہ ہیں . . .
معبودھم ذو اعضاء	یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کا معبود اعضا والا
ومنھم الکرامیة فی دعواھا ان	ہے، . . . . اور ان میں سے کرامیہ ہیں انکا
اللہ تعالیٰ جسم له حد ونھایة	دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے اسکی حد ونہایت
وانه محل الحوادث وانه مماس	ہے، اور وہ حوادث کا محل ہے اور وہ اپنے
لعرشه . . . . فھؤلاء مشبھة	عرش سے مماس ہے . . . پس یہ اللہ تعالیٰ کو
للہ تعالیٰ بخلقه فی ذاته فاما	خلق سے ذات میں تشبیہ دینے والے ہیں اور
المشبھة لصفاته بصفات	اس کی صفات کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ
المخلوقین فاصناف منھم شبھوا	دینے والوں کی بھی کئی قسمیں ہیں، ان میں
ارادة اللہ تعالیٰ بارادة خلقه	سے ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے کو اسکی
. . . . . ومنھم الذین شبھوا	مخلوق کے ارادے سے تشبیہ دیتے ہیں . . .
کلام اللہ عزوجل بکلام خلقه	. . . اور ان میں سے وہ لوگ ہیں جو اللہ عزوجل
. . . . [1]	کے کلام کو اسکی خلق کے کلام سے تشبیہ دیتے ہیں۔

یہ فصل فرقہ مشبہہ کے ذکر میں ہے، لیکن فرقہ حلولیہ کا ذکر انھوں نے چوتھے باب میں فرمایا ہے۔

[1] الفرق بین الفرق ص ۲۱۴-۲۱۶۔

الفصل التاسع من هذا الباب
في ذكر اصناف الحلولية وبيان
خروجها من فرق الاسلام
الحلولية في الجملة عشر فرق
..... اما السبابية فانما دخلت
في جملة الحلولية لقولها بان
عليا صار الها بحلول روح الاله
فيه وكذلك البيانية زعمت
ان روح الاله دارت في الانبياء
والائمة حتى انتهت الى علي.....
ثم حلت بعده في بيان بن سمعان
.....وكذلك الجناحية منهم
حلولية لدعواها روح الاله دارت
في علي واولاده..... فكفرت
بدعواها حلول الاله في زعيمها
.....والشريعية والنميرية
منهم حلولية لدعواها ان روح
الاله حلت في خمسة اشخاص
النبي وعلي وفاطمة والحسن والحسين

اس باب کی نویں فصل حلولیہ کے مختلف
اصناف کے ذکر میں اور ان کے دائرۂ اسلام
سے خارج ہونے کے بیان میں ہے۔ حلولیہ
کل دس فرقے ہیں..... سبابیہ حلولیہ
میں اس وجہ سے داخل ہیں کہ وہ کہتے ہیں
کہ حضرت علیؓ خدا ہو گئے کیونکہ خدا کی روح
ان میں حلول کر گئی تھی، اسی طرح بیانیہ
کا گمان ہے کہ خدا کی روح انبیا اور اماموں
میں گردش کرتی رہی یہاں تک کہ حضرت
علیؓ تک پہونچی.........
پھر بیان بن سمعان میں حلول کر گئی...
.....اسی طرح جناحیہ ان میں سے حلولیہ
ہیں، کیونکہ وہ دعوی کرتے ہیں کہ خدا کی روح
حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں گردش کرتی
رہی..... پس انھوں نے یہ دعوی کرکے کہ اللہ تعالیٰ
ان کے پیشوا میں حلول کر گیا، کفر کیا.....
اور شریعیہ اور نمیریہ ان میں سے حلولی ہیں۔
کیونکہ وہ دعوی کرتے ہیں کہ خدا کی روح
پانچ اشخاص یعنی نبی، علی، فاطمہ، حسن اور حسین

..... والمقنعية كان زعيمهم
المعروف بالمقنع...... زعم
لاتباعه انه هو الاله وانه
قد تصور مرة في صورة آدم
ثم تصور في وقت آخر بصورة
نوح.... ثم انه زعم انه في
زمانه الذي كان فيه قد تصور
بصورة هشام بن حكيم وكان
اسمه هاشم بن حكيم.....
واما الحلمانية من حلولية...
انه كان يقول بحلول الاله في
الاشخاص الحسنة وكان هو
واصحابه اذا راوا صورة حسنة
تسجد والها يوهمون ان الاله
قد حل فيها[1]

میں حلول کر گئی..... اور مقنعیہ تو ان کا
پیشوا ایک شخص مسمی بالمقنع تھا..... اپنے
پیرووں کے لیے گمان کیا کرتا کہ وہ خدا ہے،
اور یہ کہ ایک مرتبہ اس نے حضرت آدمؑ
کی صورت اختیار کی، پھر دوسری مرتبہ
حضرت نوحؑ کی... پھر اس نے گمان کیا
اپنے زمانہ میں وہ ہشام بن حکیم کی صورت
میں نمودار ہوا، اور اس کا نام ہاشم بن
حکیم تھا..... اور حلمانیہ حلولیہ سے
ہیں..... وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ
کی روح خوبصورت شخصوں میں حلول کر جاتی
ہے اور وہ اور اس کے پیرو جب کسی اچھی
صورت کو دیکھتے تو سجدہ کرتے اور یہ وہم
کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس میں
حلول کر گیا ہے۔

غالباً اس تصریح کے بعد تشبیہ اور حلول کا فرق معلوم ہو گیا ہوگا، مگر شہرستانی نے اور اس کی تقلید میں بیدار صاحب نے "اہل التشبیہ" کو "حلولیین" بنا دیا۔

(۳) کتاب فی خلق الاعمال: معتزلہ اور قدریہ کے عقیدہ خلقِ اعمال کے رد میں۔[2]

---

[1] الفرق بین الفرق ص ۲۴۱ - ۲۴۵ [2] معارف ص ۲۹، سطر ۶

معتزلہ اور قدریہ اور عقیدہ خلق اعمال ؟ یہ بھی ایک رہی، اور اس پر امام اشعری کا رد گویا کہ وہ عقیدہ خلق اعمال کے منکر تھے، اصل میں ہے :-

والفنا کتاباً فی خلق الاعمال نقضنا فیه اعتلالات المعتزلة والقدریة فی خلق الاعمال وکشفنا عن تمویهم فی ذالك[1]

ہم نے عقیدہ خلق اعمال کے اثبات میں ایک کتاب تصنیف کی جس میں معتزلہ اور قدریہ جو عقیدہ خلق اعمال کے خلاف دلائل قائم کیا کرتے تھے، اس کا رد کیا ہے، اس باب میں ان کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

یہ تو امام اشعری اپنی کتاب کا موضوع بتاتے ہیں، مگر مسٹر مکارتھی نے اس کو بالکل ہی الٹ کر دیا ہے کہ معتزلہ و قدریہ عقیدہ خلق اعمال کے قائل تھے، اور امام اشعری نے عقیدہ خلق اعمال کا رد کیا ہے۔

شرح المواقف میں ہے۔

فیکون فعل العبد مخلوقاً لله تعالیٰ ابداعاً واحداثاً ومکسوباً للعبد .... وهذا مذهب الشیخ ابی الحسن الاشعری۔

پس بندہ کا فعل باعتبار ابداع و احداث (نو پید اساختن) اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہوگا اور بندے کا کسب کیا ہوا .... اور یہ شیخ ابو الحسن الاشعری کا مذہب ہے۔

اسی طرح امام عبد الکریم الشہرستانی نے الملل والنحل میں امام اشعری کے مسلک کے ضمن میں افعال عباد کے متعلق ان کا مذہب اس طرح نقل کیا ہے۔

وارادته احدة قديمة ازلية

اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ واحد ہے جو قدیم و

[1] تبیین ص ۱۲۹ سطر ۶-۱۱

متعلقة بجميع ...... افعال عباده من حيث انها مخلوقة يسمى هذا الفعل كسباً فيكون خلقاً من الله تعالیٰ ابداعاً واحداثاً وكسباً من العبد حصولاً تحت قدرته۔[1]

ازلی ہے، اور جو متعلق ہے ...... اس کے بندوں کے تمام افعال کے اس حیثیت سے کہ وہ افعال مخلوق ہیں۔ اس فعل کا نام کسب رکھا جاتا ہے پس فعل بحیثیت ابداع و احداث اللہ تعالیٰ کی جانب سے خلق کیا ہوا ہوتا ہے، اور بندے کا کسب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت میں حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح امام عبد القاہر البغدادی نے الفرق بین الفرق میں اشاعرہ کے مذہب کے متعلق لکھا ہے۔

انه (ای الله) خالق اکساب العباد ولا خالق غیر الله خلاف قول من زعم من القدریة ان الله تعالیٰ لم یخلق شیئاً من اکساب العباد[3]

وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) بندوں کے افعال کا خالق ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے، برخلاف قدریہ کے ایک گروہ کے قول کے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال میں سے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔

اسی طرح امام رازی نے الاربعین فی اصول الدین میں فرمایا ہے۔

الفرقة الرابعة الذین یقولون لا تاثیر لقدرة العبد فی الفعل ولا فی صفة من صفات

فرقہ چہارم وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ بندے کی قدرت کی فعل یا فعل کی صفات میں سے کسی صفت میں کوئی تاثیر نہیں ہے، البتہ

[1] الملل والنحل للشہرستانی ج ۱ ص ۹۴ [2] ایضاً ص ۹۳ [3] الفرق بین الفرق ص ۳۲۷

الفعل بل الله تعالیٰ يخلق الفعل ويخلق قدرة متعلقة بذلك الفعل ولا تاثير لتلك القدرة البتة في ذلك الفعل وهذا قول ابي الحسن الاشعري[1]

اللہ تعالیٰ فعل کو پیدا کرتا ہے اور اسی متعلق جو قدرت ہوتی ہے اسے پیدا کرتا ہے، اور اس قدرت کی اس فعل میں کوئی تاثیر نہیں ہے، اور یہ امام ابوالحسن الاشعری کا قول ہے۔

اور خود امام ابوالحسن الاشعری اپنی کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" میں اپنا مذہب تحریر فرماتے ہیں کہ

وانه لا خالق الا الله وان اعمال العبد مخلوقة مقدرة كما قال خلقكم وما تعملون[2]

اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے، اور بندوں کے اعمال مخلوق ہیں مقدر ہیں جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے اعمال کو

اس کے برعکس معتزلہ قدریہ خود انسان کو اپنے افعال کا موجد سمجھتے تھے، شرح مواقف میں ہے۔

وقالت المعتزلة اي اكثرهم هي (يعني افعال العباد الاختيارية) واقعة بقدرة العبد وحدها على سبيل الاستقلال بلا ايجاب بل اختيارا

اور معتزلہ نے یعنی اکثر معتزلہ کہتے ہیں کہ وہ (یعنی بندوں کے اختیاری افعال) صرف بندوں کی قدرت سے واقع ہوتے ہیں، استقلالاً بغیر کسی چیز کے واجب و لازم کیے ہوئے بلکہ اپنے ذاتی اختیار سے۔

اسی طرح امام عبدالقاہر البغدادی نے معتزلہ کے اصول میں لکھا ہے۔

---

[1] الاربعین للامام الرازی ص ۲۲۸ [2] الابانہ للامام الاشعری ص ۶۔

ومنها قولهم جميعا بان الله تعالى غير خالق لاكساب الناس ولا لشيء من اعمال الحيوانات[1]

اور معتزلہ کے مخصوص عقائد میں سے ان سب کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے کسب کا پیدا کرنے والا نہیں ہے اور حیوانات کے اعمال میں سے کسی چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔

اسی طرح امام رازی نے المحصل میں لکھا ہے۔

وزعم الجمهور من المعتزلة ان العبد موجد لافعاله لا على نعت الايجاب بل على صفة الاختيار[2]

جمہور معتزلہ نے گمان کیا ہے کہ بندہ خود اپنے افعال کا پیدا کرنے والا ہے، اس طور پر نہیں کہ وہ ایسا کام کرنے پر مجبور ہو بلکہ اپنے ذاتی اختیار سے۔

اور خود امام اشعری نے الابانہ میں معتزلہ اور قدریہ کے متعلق لکھا ہے۔

وزعموا انهم ينفردون بالقدرة على اعمالهم دون ربهم فاثبتوا لانفسهم الغنى عن الله عز وجل ووصفوا انفسهم بالقدرة على ما لا يصفون الله عز وجل بالقدرة عليه[3]

اور معتزلہ نے گمان کیا کہ وہ اپنے اعمال پر بغیر اپنے پروردگار کے قدرت رکھنے میں منفرد ہیں، پس انھوں نے اپنی ذات کے واسطے اللہ تعالیٰ سے بے پروائی کو ثابت کیا اور اپنے نفس کو اس چیز پر قدرت رکھنے کے ساتھ متصف کیا جس پر قدرت کے ساتھ وہ اللہ عزوجل کی ذات کو متصف کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ امام اشعری خلق اعمال کے قائل تھے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] الفرق بین الفرق ص ۹۴ [2] المحصل ص ۱۲۱ [3] الابانہ ص ۴

اپنے بندوں کے اعمال کو خلق فرمایا ہے، یہی سلف صالحین کا عقیدہ تھا، چنانچہ امام بخاری نے "خلق افعال عباد"[1] کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے، اس کے علاوہ اپنی "صحیح" میں متعدد آیات و احادیث کی توضیح کے لیے ابواب قائم کئے ہیں، جن کا مقصد فرقہ معتزلہ کا رد ہے، اہل سنت والجماعت کے مقابلے میں معتزلہ و قدریہ بندہ کو اپنے افعال کا موجد بالاستقلال مانتے تھے، اور اہل سنت کے موقف کے خلاف دلائل قائم کرتے تھے، چنانچہ ان کے دلائل کو قاضی عضد الدین الایجی نے مواقف . . . کے موقف خامس مرصد سادس مقصد اول میں اور امام رازی نے المحصل (ص ۱۴۱ - ۱۴۴) میں اور اربعین میں (ص ۲۳۳ - ۲۳۷) میں تفصیل بیان کیا ہے، اور ان پر تبصرہ بھی کیا ہے، لیکن اس تفصیل و تبصرہ کا اکثر حصہ امام اشعری سے ماخوذ ہے، جس کا کچھ حصہ انھوں نے "الابانہ" (ص ۵۶ - ۴۷) میں بیان کیا ہے۔

غرض امام اشعری سلف صالحین کی طرح خلق اعمال کے قائل تھے، اور معتزلہ و قدریہ اس کے منکر، اور امام صاحب نے اس کتاب میں منکرین کے دلائل کا رد کیا ہے، مگر مستر مکارتھی یہ سمجھے کہ معتزلہ و قدریہ خلق اعمال کے عقیدے کے معتقد تھے، اور امام اشعری نے اس کتاب میں اس عقیدہ کا رد کیا ہے۔

(۴) کتاب کبیر فی استطاعت :- اس میں استطاعت کے بارے میں معتزلہ کے دلائل رد کیے ہیں، اصل میں ہے :-

والفنا کتابا کبیرا فی الاستطاعة	ہم نے معتزلہ کے علی الرغم استطاعت کے موضوع پر
علی المعتزلة نقضنا فیه	ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس میں معتزلہ کے
استدلالاتهم علی انها	ان دلائل کا رد کیا ہے، جو "الاستطاعت
قبل الفعل وسائلهم	قبل الفعل" پر قائم کیا کرتے ہیں، اور اس میں
وجواباتهم۔[2]	ان کے سوالات ہیں اور ان کے جوابات ہیں،

[1] المعارف ص ۲۵۰ سطر ۸۰ [2] تبیین ص ۱۲۹ سطر ۱۱ - ۱۳۔

کیا یہ مفہوم اس گمراہ کن ترجمے سے ادا ہو جاتا ہے؟ کیا اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ معتزلہ استطاعت قبل الفعل کے قائل تھے، یا استطاعة مع الفعل کے اور اشاعرہ کا مسلک کیا ہے، اور انھوں نے کس بات کی تردید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "استطاعة" کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے، چنانچہ صرف اس مسئلے پر معتزلہ کے مذاہب کو امام ابو الحسن الاشعری نے "مقالات الاسلامیین" جلد اول کے ص ۲۲۹ سے ص ۲۴۲ تک نقل کیا ہے، اس سلسلہ میں متعدد سوالات قائم ہوتے ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ استطاعۃ فعل کے پہلے ہوا کرتی ہے یا بعد میں، ان دو شقوں میں سے معتزلہ نے پہلی شق کو اختیار کیا تھا، اور اسی پر ان کا اجماع تھا، چنانچہ امام اشعری نے "مقالات الاسلامیین" میں لکھا ہے :-

واجمعت المعتزلة علی	معتزلہ نے اس بات پر اجماع کیا ہے،
ان الاستطاعة قبل الفعل	کہ استطاعۃ قبل فعل کے ہوا کرتی ہے،
وهی قدرة علیه وعلی	اور استطاعۃ کے معنی فعل پر اور اس کی
ضده وهی غیر موجبة	ضد پر قدرت کے ہیں، اور استطاعت
للفعل[1]	فعل کی موجب نہیں ہوا کرتی۔

اس کے مقابل اہل سنت والجماعت کا کہنا ہے کہ استطاعۃ فعل کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ خود امام اشعری نے "الابانہ" میں لکھا ہے۔

وان احد الایستطیع	اور کوئی شخص کسی کام کو کرنے کی
ان یفعل شیئا قبل ان یفعله[2]	اس کے کرنے سے پہلے استطاعت نہیں رکھتا،

[1] مقالات الاسلامیین ص ۲۳۰۔ [2] الابانہ ص ۶۔

اور یہی عامۂ اہل سنت والجماعت کا موقف ہے، عقائد نسفی میں ہے۔

والاستطاعة مع الفعل — اور استطاعت فعل کیساتھ ہوا کرتی ہو

خلافاً للمعتزلة۔ — برخلاف معتزلہ کے عقیدے کے۔

غرض اس مبسوط کتاب میں امام اشعری نے معتزلہ کے نظریہ کا کہ استطاعت فعل سے قبل ہوا کرتی ہے، رد کیاہے، مگر مسٹر مکارتھی نے جو ترجمہ کیاہے، اس معلوم ہوتا ہے کہ "استطاعة" بھی "المنزلة بین المنزلتین" یا "تولد" کی قسم کا کوئی مسئلہ تھا جو صرف معتزلہ کے ساتھ مختص تھا، اور امام اشعری نے اس کا سرے سے انکار کرکے اسکا رد کیا ہے۔

(باقی)

۱؎ معارف۔ صفحہ ۱۹۰، سطر ۹-۱۲۔

الکلام

علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ کلامیہ کی سب سے اہم اور معرکۃ الآرا کتاب جس میں عقلی دلائل وبراہین سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیاہے، اور ملاحدہ اور منکرین مذہب کے گمراہ کن دلائل کا رد کیاہے، اور اسلام کے عقائد واصول کی فلسفیانہ تشریح کی ہے، اس کے انداز بیان سے کچھ لوگوں کو مولانا کی طرف سے غلط فہمی ہو گئی تھی، اس کے ازالہ کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کے دوسرے اڈیشن میں شروع میں بہت ہی مبسوط مقدمہ لکھاہے، جس میں مولانا شبلی کی طرف سے پوری قوت سے دفاع کیاہے۔ مطبوعہ۔ معارف پریس اعظم گڈھ۔

قیمت :- ۱۹ روپیہ

ہندوستان کا اسلامی ادبی دبستان

اس کے وجود وترقی کے اسباب اور اس کی امتیازی خصوصیات

از
مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی لکھنؤ

یہ اس عربی مقالہ کا ترجمہ ہے، جو رابطۃ ادب الاسلامی کے افتتاحی عمومی اجلاس منعقدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ ۸ جنوری ۱۹۸۶ء کو خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کیا گیا، ترجمہ مولانا شمس تبریز صاحب رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے قلم سے ہے۔

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ!

حضرات! دنیا کا پرانا اور عام دستور ہے کہ باہر سے آنے والے معزز مہمانوں اور عزیز دوستوں کو تحفہ میں وہی چیز دی جاتی ہے، جو اس ملک کی خاص مصنوعات میں سے ہو، یا وہاں کی پیداوار اور اس ملک کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہو، اسی کو "سوغات" کہتے ہیں، اگر باہر سے کسی ملک کے آنے والوں کو اسی ملک سے درآمد کی ہوئی کوئی چیز پیش کی جائے، تو ان کو یہ کہنے کا حق ہے کہ "بضاعتنا ردت الینا" (ہماری ہی پونجی ہم کو واپس کی گئی) اس لیے میں اس افتتاحی اجلاس میں جو ادب اسلامی کے موضوع پر منعقد ہو رہا ہے، اور جہاں متعدد عرب ممالک کے ممتاز ادباء، اہل قلم اور ادب اسلامی پر کام کرنے والے جمع ہیں، ان کے ملک یا عالم عربی میں ادب اسلامی پر ہونے والے کام کی داستان سنانے کے بجائے برصغیر ہند کے ادبی اسلامی دبستان کی کہانی سنانے کی ترجیح دونگا، جو اس ملک میں مسلمانوں کے آنے اور زمام اقتدار یا زمام قیادت ہاتھ میں لینے کے بعد

وجود میں آیا اور ان کے دور حکومت اور قیادت کے بعد بھی اس نے اپنا کام جاری رکھا، اور بعض حیثیتوں سے ترقی کی،
وہ اس کا ہر طرح مستحق ہے، کہ اسلامی ادب کے قدیم اندلسی دبستان، مغرب اقصیٰ کے ادبی اسکول، اور ایرانی
مکتب فکر و ادب کے ساتھ اس کا ذکر کیا جائے، جس کے ارتقاء، و امتیاز کے کچھ طبعی و تاریخی اسباب ہیں جن کا ہم
اجمالاً ذکر کریں گے۔

ہندوستان میں بہت سے مختلف نسلی و ثقافتی تہذیبی اور سیاسی عوامل (Factors) ایک دوسرے
پر اثر انداز ہوئے، جو پہلے ہی سے مختلف زبانوں، ثقافتوں اور فلسفوں کا گہوارہ تھا جس کا یہ فطری تقاضا
کہ ہندوستانی مسلمان کم بیش اس سے متاثر ہوئے، اور اس طرح ادب اسلامی کا ایک مستقل اور مخصوص مزاج
و منہاج رکھنے والا اسکول وجود میں آگیا، جو اپنے جذبہ کی شدت، نزاکت احساس، گیرائی اور گہرائی، دلوں کے
تار چھیڑنے کی صلاحیت، شوق انگیزی و نغمہ ریزی، اسلامی حمیت کی بیداری، ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
ربط قلبی و ایمانی اور حرمین شریفین اور جزیرۃ العرب سے تعلق اور نئے معانی و مضامین اور تعبیروں کی ایجاد و
اختراع کے لحاظ سے امتیاز خاص رکھتا ہے۔

اس ادبی اسکول کو اس ملک میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے اور اس پر آٹھ سو سال حکومت کرنے
اور یہاں کے عوام کا اپنے علم و فلسفہ، قدیم تہذیب کے معاملہ میں احساس برتری میں مبتلا ہوتے اور نسلی و طبقاتی
امتیاز نے مسلمانوں کی عام طور پر اور شعراء و ادباء کی نفسیات کی تعمیر میں خاص طور سے بنیادی حصہ لیا، اور اس کے
نتیجہ میں ان کے اندر ہر قسم کے چیلنجوں اور آزمائشوں سے (خواہ وہ سیاسی ہوں یا فکری، فلسفیانہ ہوں یا ادبی و فنی)
عہدہ برآ اور نبرد آزما ہونے کی قوت و صلاحیت پیدا ہوگئی، کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی اسلامیت اور ایک خاص
عقیدہ، معین شریعت، اور ممتاز شخصیت رکھنے والی قوم کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتے تھے،

اس صورت حال نے اسلام سے گہرا تعلق اور اس پر فخر اور مشاہیر اسلام کے کارناموں پر ناز کرنے کا
جذبہ پیدا کر دیا، اور اپنی فنی، ادبی صلاحیتوں کا رخ اسلامی غزوات و فتوحات کی طرف کرنے پر آمادہ کیا

جس کے نتیجہ میں اردو میں (جو مسلمانوں اور ہندوستان کی ترقی یافتہ زبان ہے) بڑے پرزور، مؤثر اور مفصل اسلامی شاہنامے[1]
لکھے گئے، اور ان کو ہندوستان میں ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، جو عالم اسلام میں شاید ہی کسی تاریخی
نظم یا قصہ کو حاصل ہوئی ہوگی، اسلامی جذبات و احساسات کی بیداری، دینی حمیت اور انفرادی و اجتماعی
مصائب و حوادث کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کرنے میں ان شعری مجموعوں کا بڑا اہم کردار ہے۔
کیونکہ وہ اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو اولین اسلامی کارناموں، اللہ کی راہ میں شوق شہادت، بعض
مواقع پر مسلمان خواتین کی بہادری و مردانگی، اعزہ و اقرباء کی شہادت پر مجاہدوں اور غازیوں اور مسلم گھرانوں اور مسلم
خواتین کے مثالی صبر و شکر اور ایمان و احتساب کے سچے واقعات یاد دلا کر ہمت بندھاتے اور حوصلہ بڑھاتے تھے۔

ہمارے جغرافی و تاریخی اور سیاسی ماحول کے خوشگوار اور مبارک عطیات میں نعت نبوی کا وفور اور اسکی
قوت و تاثیر، اور اس کی لطافت و حلاوت بھی ہے، ہندوستانی نثر و نعت گو شعراء نے نئے نئے معانی و اسالیب
پیدا کیے، اور بڑی نازک خیالی سے کام لیا، ایسی عمدہ و بے مثل نعتیں کہیں جن کی خود ادب عربی میں صدیوں تک

---

[1] ان میں سب سے ضخیم شاہنامہ "صمصام الاسلام" منشی سید عبدالرزاق حسنی کی تالیف ہے جس میں انھوں نے
واقدی کی "فتوح الشام" کو اردو میں نظم کیا ہے، اور جو پچیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور طاقتور اسلوب، حلاوت،
صداقت اور تعبیر کی بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے، وہ مختلف تقریبات میں اسلامی گھرانوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا، اور
سننے والوں میں دینی حمیت اور اسلامی جذبات کو برانگیختہ کرتا تھا، اس سلسلہ میں راقم کا مقالہ "میری محسن کتابیں" دیکھا جاسکتا ہے۔
(شامل مجموعہ "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں") ایسی ہی کتابوں میں شہرہ آفاق اسلامی شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس
"مد و جزر اسلام" بھی ہے جس میں انھوں نے عہد جاہلیت، بعثت محمدیہ اور صحابہ رض و تابعین کے عظیم اصلاحی، اور انقلابی اور تعمیری کارناموں
اور اگلے مسلمانوں کی شاندار خدمات کی سچی تصویر پیش کرنے کے بعد دور آخر کے مسلمانوں کے زوال و اضمحلال اور مسلم معاشرہ کی پستی
اور انحطاط کو بھی بڑے ساحرانہ اسلوب میں دکھایا ہے، ایسے ہی شعری مجموعوں میں حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" بھی ہے
جو ہندوستان کے مشہور شاہناموں کی صف اول اور مقبول ترین قومی منظومات میں ہے۔

کوئی مثال نہیں ملتی، عربی میں یہ صنف سخن بوصیریؒ کے قصیدہ بُردہ، اور سیدی عبد الرحیم برعیؒ کے نعتیہ قصائد کے بعد بہت کمزور پڑ گئی تھی، محققین و علمائے ادب برابر اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، بعض لوگوں نے اس فرق و جہ دوری اور مہجوری کو بتایا ہے، جس کا دل کے سوتوں کو بہانے، نادر خیالات پیدا کرنے، اور سوئے ہوئے جذبات و احساسات کو جگانے میں بڑا دخل رہا ہے، بہت سے نعت گویوں نے بلیے اور پُر خطر اسفار کے سبب جس سے مسلمانوں کو طویل عرصہ تک سابقہ رہا، شعر کا سہارا لیا، وہ زمانہ بحری قزاقوں، بادبانی کشتیوں اور غیر محفوظ رستوں کا تھا، حتیٰ کہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا، اور حاجیوں کے قافلے بھی غارتگری اور رہزنی کے شکار ہو جاتے تھے، اس لئے نعت گو شعراء نے اشعار کے ذریعہ اپنے ذوق و شوق کی ترجمانی کی کیونکہ شعر ہمیشہ سے شوق و محبت کا نامہ بر کبوتر اور سفیر رہا ہے، جس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں حائل ہوتی، جب پیالہ لبریز ہو جاتا ہے تو چھلکنے اور بہنے بھی لگتا ہے، سیرابی کے بعد مدہوشی، اور سرود کے نغمہ ریزی ایک فطری چیز ہے، جسے عرب شاعر نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ ے

سقونی وقالوا لا تغنّ ولو سقوا

جبال سُلیمیٰ ما سُقیتُ لغنّت

انھوں نے مجھے شراب لطف و محبت پلا کر مجھے گانے اور گنگنانے سے منع کر دیا، حالانکہ اگر وہ سلیمیٰ پہاڑ کو وہ شے پلاتے جو مجھے پلائی گئی ہے تو وہ بھی مست و بے خود ہو کر گانے لگتا۔ ۱

پھر انگریزوں کا ہمہ گیر حاکمانہ مسلم بیزار دور آیا، مسلمان قافلۂ انسانی کی قیادت اور فکری و تہذیبی رہنمائی کے میدان میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے، اور انھوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اب انھیں ثقافتی و ایمانی، اخلاقی و تہذیبی اور اندرونی و باطنی استعمار کا مقابلہ کرنا تھا، جو سیاسی و حکومتی استعمار سے کہیں زیادہ خطرناک اور ضرر رساں ہوتا ہے، چنانچہ اس چیلنج کو اہل قلم، اور شعراء و مصنفین کی نئی نسل نے قبول کیا، اور انگریزی حکومت اور اس کے خفیہ و خطرناک منصوبہ کے

خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، جس کے تحت مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نئی نسل کو اپنے مفادات و اغراض کے لیے استعمال کرنا اور اسلام سے ان کو باغی بنانا تھا۔

اس موقعہ پر متعدد عظیم و عبقری شعراء سامنے آئے جیسے لسان العصر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، اور منفرد و نادرہ کار شاعر ظفر علی خاں، جنھوں نے نئی تعلیم یافتہ نسل میں نہ صرف اسلامی غیرت و حمیت بیدار کی، بلکہ نئے چیلنجوں کے لئے قوت مقابلہ، بیرونی و جارح تہذیب سے نفرت و کراہت کا طاقت ور جذبہ بھی پیدا کیا، اور اس کے لیے انھوں نے کبھی اکبر الہ آبادیؒ کی طرح بھرپور مزاح و ظرافت اور چٹکیاں لینے والے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیا، اور کبھی سنجیدہ اسلوب اور بلیغ اشعار کا سہارا لیا، جو جوش و قوت کا سرچشمہ اور سلاست و حلاوت کی جوئے رواں ثابت ہوئے، ان شعراء کے احساسات کو مغربی ثقافت نے بری طرح جھنجھوڑ دیا، اور ان کے فکر و شعور کو سخت ردّ عمل پر مجبور کر دیا تھا جس نے ان کی شاعری کو ایک پر جوش و پر خروش آبشار میں بدل دیا۔

یہاں ایک اور قابل غور تاریخی حقیقت ہے، جو دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ جائزہ اور تہذیبی تحلیل نفسی کی محتاج ہے، کہ علوم دینیہ اور آداب اسلامیہ میں مرکزیت اور قیادت کا مرتبہ رکھنے والے عرب ممالک سے ذہین و فطین مسلم نوجوان مغرب کا رُخ کرتے ہیں لیکن وہاں کی بڑی جامعات خصوصاً انگلستان و فرانس کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پا کر اپنے وطنوں کو ایسے ذہن و روح کے ساتھ واپس نہیں آتے جو مغربی تہذیب اور اس کے معیار و اقدار کی ناقد اور ان کی منکر ہو، اور مغربی استعمار کے دور اس اغراض و مقاصد اور مشرق اسلامی کو مغرب زدہ اور اسلام سے دور کرنے کی خفیہ و خطرناک اسکیموں اور چالوں کو سمجھتی ہو، اور اسلام کی نہ صرف بقا کی بلکہ عالمی قیادت کی صلاحیت پر پورا اعتماد اور اسلام سے

---

۱ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "الحضارة العربية الوافدة، وأثرها في الجيل المثقف كما يراها شاعر الهند الكبير لسان العصر السيد أكبر حسين الإله آبادي" (طبع مكتبة الصحوة، قاهرہ) ملاحظہ ہو۔

ایسا گہرا ربط وتعلق رکھتی ہو جیسا کہ حکیم مشرق اور شاعر اسلام ڈاکٹر محمد اقبال، اور تحریک خلافت کے قائد اور جنگ آزادی کے مرد مجاہد مولانا محمد علی (مدفون بیت المقدس) کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے، میں یہاں مصر و شام اور مغرب عربی کے ان ادبا و اہل قلم کے نام نہیں گناؤں گا، جنھوں نے ایک طویل مدت تک مشرق عربی و اسلامی کی فکری و ادبی قیادت کی اور جو نہ صرف تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے بلکہ عربی زبان کے ماہرین و ناقدین اور اساتذہ کے لیے بھی اسوہ و معیار کی حیثیت رکھتے تھے، جن سے حاضرین کرام بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کے سلسلہ میں آپ مجھے اجازت دیں کہ اپنی کتاب "نقوش اقبال" کے مقدمہ سے ایک اقتباس پیش کروں، جس میں ان کی انفرادیت وخصوصیت کی طرف بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔

"سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے، اور جس کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں، میں ہر اس ادب و پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا، اور تسخیر کائنات، اور تعمیر النفس و آفاق کے لیے ابھارتا ہے، جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے، میری پسند اور توجہ کا مرکز دراصل یہ ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، ایک عقیدہ، دعوت و پیغام رکھتے ہیں، اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں، وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور اقبال گزشتہ کے لیے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔

اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی میں نے ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا، اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں، احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں، اور رگوں میں شجاعت اسلامی کو دوڑنے لگی، میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔[1]

مولانا محمد علی کی خداداد صلاحیت اور انگریزی زبان پر غیر معمولی قدرت ان کے انگریزی مقالات میں ظاہر ہوتی ہے، جو ان کے ہفتہ وار انگریزی اخبار (Comrade) کے صفحات کی زینت ہوتے تھے، اور جو انگریزی کی کامیاب طنز نگاری کا شاہکار ہوتے تھے، جس پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے، جو اہل زبان اور ادیبوں جیسا بلند مذاق رکھتا ہو، کیونکہ کسی زبان میں بھی طنز نگاری ادب کی سب سے مشکل صنف مانی گئی ہے، جس کو نبھانا بہت مشکل ہوتا ہے، ان کے شعلہ بار مقالات، اسلامی جوش اور برطانوی حکومت پر سخت تنقید سے بھرے ہوتے تھے، مگر اس کے باوجود انگریز حکام بھی ان کو پڑھنے کے شوقین تھے، اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، اسی طرح ان کے اردو روزنامہ "ہمدرد" کے افتتاحیے بھی (جو "کامریڈ" کا جانشین تھا) بڑے طاقتور اسلوب اور جرأت مندانہ لہجہ میں لکھے جاتے تھے، انکے علاوہ اردو نظم میں بھی انھوں نے مؤثر انداز میں اپنے اسلامی جذبات، مجاہدانہ رجحانات، عشق نبوی، اسلام کی محبت اور اس کی راہ میں شہادت کے احساسات کا اظہار کیا ہے، جسے لوگوں نے یاد کر لیا اور اپنی تقریر و تحریر میں اس سے کام لیا۔

مولانا ظفر علی خاں مشہور روزنامہ "زمیندار" کے مدیر شہیر، اپنے زمانہ کے بڑے شعراء میں تھے، بڑی بڑی نظمیں فی البدیہہ اور ان کی آن میں کہہ ڈالتے تھے، مشکل بحروں اور قافیوں پر انھیں عجیب قدرت حاصل تھی، ان کا کلام بھی سست گام قافلۂ اسلام کے لئے ایک نعرۂ حدی اور للکار، اور اسلام کے خادموں اور کارکنوں کے لیے جوش آفریں نغمہ ثابت ہوا، وہ پر شوکت الفاظ، نغمگی و شیرینی کے لیے ممتاز ہے اور ایک اچھلتے ابلتے چشمہ کی کیفیت رکھتا ہے، ان کا نعتیہ کلام ہمارے زمانہ کا بہترین و بلیغ نعتیہ کلام تھا، ان کے اخبار کے شمارے وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے ضبط ہوتے رہتے۔ اور ان پر بھاری جرمانے بھی ہوتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ حکومت اور شدید فرقہ پرست ہم وطنوں اور اخبارات پر سخت تنقید سے

---

[1] "نقوش اقبال" ۳۴ - ۴۲ (طبع ششم ۱۹۸۵ء)

باز نہیں آتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء)، مغربی اتحادیوں کے حملے اور خلافت عثمانیہ کے زوال کا عالم اسلام خصوصاً اسلامی ہندوستان پر بہت بڑا اثر پڑا، جہاں کے مسلمان، خلافت عثمانیہ کی تائید وحمایت اور اسے اپنے لئے موت وحیات کا اور سب سے بڑا مسئلہ بنالینے کے سلسلہ میں ہم خیال وہم زبان ہوگئے تھے، خلافت عثمانیہ جارحانہ اتحادی حملوں کے آگے شکست کے قریب تھی، اس صورت حال سے مسلمانان ہند کے دلوں میں بڑا جوش و جذبہ پیدا ہوگیا تھا، اور عام طور پر اسلامی جذبات اور ایمانی احساسات بھڑک اٹھے تھے، ایسے وقت میں اسلامی صحافت بلکہ اسلامی قیادت کے افق پر ایک ہلال نو طلوع ہوا، جو تھوڑی ہی مدت میں بدر کامل بن گیا، وہ خلافت تحریک کے رہنما، کانگریس کے سابق صدر، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا جریدہ "الہلال" تھا، جس میں ان کے مقالات انتہائی ادبی قوت وبلاغت کے حامل ہوتے تھے، گویا وہ کسی آتشیں قلم سے لکھے جاتے تھے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں قرآنی کلمات ومحاورات داخل کیے، جو اس میں مل کر زبان وبیان کی تقویت کا باعث ہوئے، اور ادبا و اہل قلم نے اسے پسند کیا، اس لیے کہنا صحیح ہوگا کہ اس طرح اردو میں ایک اسلامی وقرآنی اسکول کا اضافہ کیا، الہلال کا ادب ایک سحر حلال اور آب زلال تھا، اور اپنی قوت وشوکت کے لحاظ سے کسی بلند آبشار کی مانند تھا۔

یہ مسلمانان ہند کی خوش بختی اور دعوت اسلامی وادب اسلامی پر اللہ کی رحمت تھی کہ اس عرصہ میں شعراء نے کوئی منفی اور اسلام بیزار رنگ وآہنگ نہیں اختیار کیا، بلکہ بڑے اور صاحب طرز واسلوب شعراء پر اللہ پر ایمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وتعلق کا غلبہ تھا، اس طرح دور اخیر کے اردو کے اکابر شعراء ممتاز مسلمان اور ان میں سے اکثر اسلامی عقائد واعمال کے پابند تھے، ان میں سرفہرست مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، شوکت علی خان فانی بدایونی، اصغر حسین اصغر گونڈوی، سید علی سکندر جگر مرادآبادی، خواجہ عزیز الحسن مجذوب، امجد حیدرآبادی، حفیظ جالندھری، اقبال سہیل، ماہر القادری، سکندر علی وجد اورنگ آبادی، اور نشور واحدی وغیرہ ہیں، جن کی وجہ سے ہندوستان میں اردو ادب اس ابتذال، فکری انارکی اور بے لگام آزادی کا شکار نہیں ہوا، جیسا کہ عربی ادب مشرق وسطیٰ میں ہوا[1]۔

ان کے پہلو بہ پہلو اردو اہل قلم بھی نمایاں ہوئے جو مستقل وممتاز ادبی اسکول اور عمدہ ومثالی طرز واسلوب کے بانی ہیں، اور وہ سب فکر وعقیدہ کے اعتبار سے پختہ مسلمان ہیں، اور ان کے یہاں عمیق ووسیع علمی تحقیقات، پختہ خیالات، متعین وصالح مقاصد اور بلاغت وسلاست موجود ہے، ان میں خاص طور پر ان حضرات کا ذکر خیر کیا جاسکتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالسلام ندوی رحمۃ اللہ علیہ، ادیب کبیر، مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ معین الدین احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن، یہاں مثالاً اور اجمالاً یہ نام لئے گئے، سب کا احاطہ کرنا مقصد نہیں۔

یہ تو اسلامیات اور علمی مباحث کا ذکر تھا، تحقیق وعلمی نقد ونظر اور تقابلی مطالعہ کے میدان میں جس کا تعلیم یافتہ نوجوانوں پر شعر وادب سے کہیں زیادہ اثر ہوتا ہے (کیونکہ فکری وعقلی تاثر شعور ووجدان اور ادبی تاثر سے زیادہ گہرا ہوتا ہے) ہندوستان میں انیسویں صدی عیسوی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد محقق اور فاضل مورخ سامنے آئے جنھوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین اور سیرت نبویہ کی تالیف کی اور اسلامی تمدن اور مشاہیر اسلام کا تعارف کرایا اور اس کے لیے دلکش ادبی اسلوب، وسیع تاریخی تحقیق، اور بے لاگ علمی تجزیہ کا طرز اختیار کیا، اور مستشرقین کی طرف سے اسلام پر اعتراضات، مسلمانوں پر اتہامات اور اسلامی شریعت وتمدن، علوم اسلامیہ کی تدوین وتاریخ اور مسلمان حکمرانوں کی سیاست وشخصیت پر الزامات کا خاص طور پر جواب دیا، ایسے مصنفین کی صف اول میں علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب سیرۃ النبی) ہیں جن کی "الفاروق" نہ صرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد کی لکھی گئی سیرتوں بلکہ کسی بھی ملک وقوم کے کسی ہیرو کے بارہ میں لکھی گئی کتابوں میں بھی ممتاز ہے،

---

[1] اس کلیہ سے دو دین بیزار شاعر شبیر حسن جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض مستثنیٰ ہیں۔

اور اس کے علاوہ ان کی دوسری سوانح عمریوں سیرۃ النعمانؒ، الغزالیؒ، سوانح مولانا رومؒ، المامون، اور ان کے مقالات "کتب خانۂ اسکندریہ" اور الجزیۃ فی الإسلام نے مسلمان نسلوں سے احساس کمتری دور کرنے اور اپنی تاریخ پر فخر کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، اسی طرح انھوں نے جرجی زیدان کے جواب میں "الانتقاد علی التمدن الاسلامی" لکھ کر عالم اسلامی کے تمام علماء (نہ کہ صرف مصر کے علماء، جو اس خدمت کے زیادہ مستحق تھے) کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا، جس کا اعتراف مصر میں کتاب کے ناشر علامہ سید رشید رضا مدیر "المنار" نے بھی کیا تھا۔

اسلامی تحقیقات کے اس سلسلۂ زریں کی تکمیل اور معاصر اسلامیات کے ذخیرہ میں بے مثال کتابوں کے گرانقدر اضافہ کا کارنامہ ان کے نابغۂ عصر تلمیذ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انجام دیا، جنھوں نے اپنے استاد کی "سیرۃ النبیؐ" کی بقیہ پانچ جلدوں سے تکمیل کی جس سے وہ سیرت نبویؐ، توحید و عقائد، عبادات و اخلاق اور سیاسیات و معاملات کی دائرۃ المعارف بن گئی، ان کی دیگر کتابیں خطبات مدراس، ارض القرآن، عرب و ہند کے تعلقات، خیام، سیرت عائشہؓ، حیات مالکؒ، اور عربوں کی جہاز رانی ان کی جانکاہ محنت و عرق ریزی اور علمی تحقیقات کے اعلیٰ نمونے ہیں، اور دل کش و بلند پایہ ادبی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔

اس زریں فہرست میں ممتاز اہل قلم اور مشہور مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (بانی جماعت اسلامی) کا نام بھی ہے، جو پر قوت اسلامی تحریروں اور گراں قدر کتابوں جیسے الجہاد فی الاسلام، تنقیحات، تفہیمات اور نئے مسائل پر بہت سے اسلامی رسالوں کے مصنف ہیں، اور "ترجمان القرآن" کے مدیر بھی ہیں، جو خود ایک فکری و ادبی دبستان کی حیثیت رکھتا ہے، وہ ایک مخصوص اسلوب کے مالک ہیں، جو دفاعی اور معذرت خواہانہ نہیں بلکہ پُر از اعتماد اور خود دارانہ ہے، اس میں ادبی سلاست اور علمی متانت بھی موجود ہے ان میں علمی و فکری طور پر کچھ اختلاف کے پہلو بھی موجود ہیں، لیکن ان کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

مسلمان نوجوان نسل پر یہ بھی خدا کا فضل تھا کہ اس نے برطانوی حکومت کے اس سیاہ دور میں جب کہ نوجوانوں کو مغرب زدہ

کرنے کے لیے تعلیمی نظام سرگرم تھا۔ اردو کی سرکاری درسی کتابوں کے ایسے مصنفین پیدا کر دیے جو عقیدۃً اور عملاً مسلمان اور پختہ کار اہل قلم تھے، ان کا نوجوانوں کو ثقافتی افلاس اور کھلی بے دینی سے بچانے میں بڑا احسان ہے، وزارت تعلیم اور نصابی کمیٹی نے اردو کی درسی کتابوں کی تیاری کا کام مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے سپرد کیا، جو بچوں کے ذہن و نفسیات سے واقف اور ان کی رعایت رکھنے والے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں تھے، وہ زبان دانی میں دینداری اور اخلاق جس شامل کر دینے پر قادر اور بچوں کی پسندیدہ سلیس نظمیں لکھنے کے ماہر تھے، چنانچہ انھوں نے درسی کتابوں کا ایک سلسلہ[1] مرتب کر دیا، جس کے بارہ میں مولانا سید عبدالحی حسنیؒ اپنی کتاب "گل رعنا" میں لکھتے ہیں، کہ ہندوستان کی وزارت تعلیم بچوں کے لیے ان سے بہتر کتابیں نہیں لکھوا سکی، میری عمر کے بہت سے ادیب و اساتذہ کو اس سلسلۂ کتب کے بہت سے اچھے اشعار اب بھی یاد ہوں گے، جو قارئین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی تعظیم، اس کی نعمتوں کے شکر اور اخلاق کریمانہ کی محبت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مہذب مسلم و غیر مسلم گھرانوں کے فرزند فارسی زبان بھی پڑھتے تھے، اور درسی کتابوں میں کریما، مامقیماں، اور شیخ سعدی کی گلستان اور بوستاں شامل ہوتی تھیں، جو بچوں کی اخلاقی تعلیم اور زندگی کے تجربے سکھانے والے عالمی ادب میں سر فہرست ہیں، اور ہماری معلومات کی حد تک کسی اور زبان میں ایسے عمدہ مؤثر اسلوب و زبان میں شاید ہی ایسی کتابیں لکھی گئی ہوں، ان سب چیزوں کا طلبہ پر بڑا دیرپا اثر ہوتا تھا، جس کا کم از کم مظاہرہ دین اور اہل علم کے احترام، وضعداری اور شرافت کی شکل میں ہوتا تھا۔

ان سب کے ساتھ تاریخی ناولوں اور ادبی قصوں کا نمبر بھی آتا ہے، اس لئے کہ دل و دماغ پر ان کے ساحرانہ اثر اور قلب و ماہیت کی قدرت کو ہم سب جانتے ہیں، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد

---

[1] اردو کی ابتدائی ریڈریں، سواد اردو، ملک اردو، سفینۂ اردو۔

ناول نگاروں اور انشاء پردازوں کو اسلامی تاریخی ناول، شریفانہ انسانی تعلیمات اور خوشگوار گھریلو زندگی کا رجحان پیدا کرنے والی کتابیں لکھنے کی توفیق دی، تاریخی ناولوں کے پیشرووں میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی ہیں، اور معاشرتی ناولوں کی دنیا میں بڑے ادیب وعالم مولانا نذیر احمد دہلوی اور ان کے بعد علامہ راشد الخیری کا نام آتا ہے، جن کتابوں کا باشعور مسلم گھرانوں میں بڑا رواج تھا۔

یہاں ایک دوسری تاریخی حقیقت بھی ہے، جس کے اظہار میں شرم وتکلف سے کام نہیں لیا جاسکتا کہ وہ ایک تاریخی امانت ہے، وہ کہ علمائے ہند کی ممتاز خصوصیات میں سے یہ بھی ہے، کہ انھوں نے برصغیر ہندوپاک کی ادبی تحریکوں کی قیادت کی ہے، اور وہ فن ادب کے اس قصر رفیع کے مضبوط ارکان وستون تھے، جو ۱۸۵۷ء کے بعد قائم ہوا، اور ان میں سے ہر ایک مستقل ادبی دبستانوں کا بانی ہے، جن کی تقلید وپیروی کرنے والے اب بھی موجود ہیں، ان میں سے اکثر لوگ ادب وانشاء، اور تنقید وتاریخ ادب کے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی کتابیں اپنے موضوع پر سند مانی جاتی ہیں، ایسا اس لیے ممکن ہوسکا کہ ہندوستان میں دینی علوم، عصری ادب، اور ملکی زبان کے درمیان کوئی مستقل اختلاف نہ تھا، اور یہاں وہ خلیج حائل نہ تھی، جو بعض ملکوں میں علمائے دین اور شعر وادب سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان حائل رہی، جس نے بیک وقت دین وادب دونوں کو نقصان پہونچایا۔

اس پس منظر اور ہندوستانی مسلمانوں کو پیش آنے والے مراحل اور تاریخی ونفسیاتی عوامل (جن سے وہ طبعاً اور اللہ کی مشیت سے متاثر ہوئے) کے زیر اثر ہندوستان کا اسلامی ادبی دبستان وجود میں آیا، جس کی اپنی خصوصیات وامتیازات ہیں، اور اسلامی ادب وثقافت کے کسی مورخ کے لیے اس سے صرف نظر اور حق تلفی جائز نہیں، اسی سبب سے زبان وادب سے تعلق رکھنے والوں اور خصوصاً ادب عربی کے محققین واساتذہ کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی ہے، اور وہ اسلام سے وابستگی اور عربی کی قرآن وحدیث

اور سیرت کی زبان اور اسلامی کتب خانہ کی شاہ کلید سمجھنے کے سبب وہ کبھی ادب عربی اور دین کے درمیان علیحدگی کی دعوت وخیال قبول نہ کرسکے، بلکہ عربی کے سرمایہ اور اس کے ادبی خزانوں کے دیانتدارانہ ومخلصانہ جائزہ کے بعد ان کا یہ پختہ خیال ہوگیا کہ ادب عربی، دین ومذہب سے اپنی قوت ونشاط اور حسن وتاثیر حاصل کرتا ہے، اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "مختارات من ادب العرب" کے مقدمہ میں لکھا تھا۔

"وہ مومن اہل قلم جن پر فکر وعقیدہ کا غلبہ ہے، یا جب وہ اپنے طور پر لکھتے ہیں، تو اس سے ان کا مقصد اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا ہوتا ہے، اور وہ اس میں بے اختیار ہوتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کو پر لگ جاتے ہیں، اور ان کا وجدانی سوتا ابل پڑتا ہے، اور ان کا دل پرسوز ہوجاتا ہے، پھر ان پر معانی ومضامین کی آمد آمد ہوتی ہے، اور الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں، اور ان کی تحریریں قارئین کے دلوں پر اس لیے اثر انداز ہوتی ہیں، کہ وہ دل سے نکلی ہوتی ہیں، اور دل ہی میں جگہ پاسکتی ہیں"[1]

حاضرین کرام! ان سب باتوں نے ندوۃ العلماء (جہاں آپ جمع ہیں) کے فرزندوں کو ہندوستانی مدارس میں عربی پڑھنے والے بچوں کی اسلامی وتربیتی ضرورت کی خاطر ابتدا سے آخری مرحلہ تک نصاب تعلیم تیار کرنے پر آمادہ کیا، اور اس سلسلہ میں بچوں کے لیے "قصص النبیین" عربی ریڈریں "القراءۃ الراشدہ، منشورات" و "مختارات" عربی ادب کی تاریخ (جو زیر تکمیل ہے، اور جس میں ہندوستانی دبستان کا خصوصی ذکر ہے) مرتب کی گئیں، اسی مقصد کے پیش نظر اس ادارہ کے اہل قلم اور اہل فکر نے اس موضوع پر فکر ونظر اور عربی ادب کے ذخیرہ کا از سر نو جائزہ لینے کی دعوت دی، اور اس کے ساتھ ہی عمومی وتفریحی ادب، غزل وقصیدہ اور وقتی وشخصی اور جماعتی ادب کی . . . اپنی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا کہ ان کی بھی قدر وقیمت ہے، اور ادب کے کتب خانے اور ہمارے دلوں میں ان کے لیے بھی جگہ ہے، اور ہم اس سے بھی

---

[1] مختارات من ادب العرب" ص ۱۵- (دار الشروق - جدہ)

مستفید و محظوظ ہوتے ہیں، اور اسے ضروریات زندگی اور تقاضائے بشری میں سمجھتے ہیں، لیکن ہماری کوشش و خواہش یہ ہے کہ مقصدی اور صالح و مفید ادب کو اس کا پورا حق و مقام ملنا چاہیئے، اس کا شایان شان خیر مقدم ہونا چاہیئے، اور اس پر ٹھوس کام ہونا چاہیئے۔

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ آواز صدا بہ صحرا نہیں رہی، اور اس پر عالم عربی کے ادبی حلقوں اور عرب جامعات کے بڑے اساتذہ و ناقدین نے لبیک کہی، ان میں سے بعض پہلے سے اس فکر کے حامل اور اس کے داعی تھے، ہم ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر تین ممتاز ادیبوں کا نام لیتے ہیں، یہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن رأفت الباشا، عالی مرتبت سید عبد العزیز رفاعی، اور استاد محمد حسن بریغش ہیں جنھوں نے اسلامی تاریخ کے دل کش واقعات و حکایات، مشاہیر اسلام اور صدر اول کے ادبار و شعراء کے تعارف میں ایک پورا مکتبہ تیار کر دیا ہے، اور وہ اس کے لیے علمائے تربیت، اصحاب دعوت اور شائقین ادب کے یکساں شکریہ کے مستحق ہیں۔

اس فکر و عقیدہ کی اساس پر ندوۃ العلماء میں ۱۱-۱۳ جمادی الآخرۃ ۱۴۰۱ھ، ۱۷-۱۹ اپریل ۱۹۸۱ء میں اسلامی ادب کی عالمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں بڑے ادیبوں، اہل قلم، سعودی، خلیجی اور مصری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی تھی، اور اسی فکر و خیال کی توسیع و اشاعت اور تائید و تقویت کے لئے مکہ مکرمہ میں شعبان ۱۴۰۲ھ مئی ۱۹۸۲ء میں جامعۃ الامام محمد بن سعود، جامعۃ الملک عبد العزیز، ریاض، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے اساتذۂ کبار کی دعوت پر "رابطۃ الادب الاسلامی" کی تشکیل ہوئی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ[1] "(جو زمین پاکیزہ ہے، اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے (نفیس ہی) نکلتا ہے۔" (الاعراف - ۵۸) اس کے داعیوں اور بانیوں نے باصرار ندوۃ العلماء کو اس کا مرکز و مستقر قرار دیا، اب یہ اسی مبارک رابطہ کی پہلی کانفرنس ہو رہی ہے، ہم اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ یہ ایک نئے عہد کا آغاز اور اسلامی ادبی بیداری کی صبح نو ثابت ہو اور مستقبل کے مؤرخ لکھ سکیں کہ پندرہویں صدی ہجری ادب اسلامی کی ترقی کی صدی تھی جس طرح کہ وسیع معنوں میں عالم اسلام میں نشأۃ ثانیہ کی صدی تھی۔

(وباللہ التوفیق)

---

[1] سورۃ الاعراف - ۵۸

"خطباتِ مدراس"

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

۱۹۲۵ء میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور تصنیف "خطبات مدراس" شایع ہوئی، یہ ان کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن، مدراس کی فرمایش اور اس کے سرپرست سیٹھ محمد جمال محمد کی دعوت پر اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں دیے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر ان کا نذرانۂ عقیدت ہے، اس وقت تک وہ مولانا شبلی کی سیرت کی دو جلدوں کو مرتب کر چکے تھے، پھر ۱۹۲۴ء میں اسی سلسلہ کی اپنی لکھی ہوئی جلد سوم شایع کی، اس کے بعد چار جلدیں اور لکھیں، سیرۃ نبوی کا ان کا گہرا مطالعہ برابر جاری تھا، جس سے اس کے سارے پہلوؤں کے نہ صرف رمز شناس بلکہ عارف ہوتے جا رہے تھے، اسی لیے جب ان خطبات کو لکھنے بیٹھے تو یہ کتاب ان کے سارے مطالعہ کا عطر مجموعہ بن گئی، اور شاید اس کو لکھتے وقت ان کو خود احساس ہوا ہوگا کہ اس کو وہ خود نہیں لکھ رہے ہیں، بلکہ کوئی روحانی قوت اور یزدانی طاقت ان سے یہ لکھوا رہی ہے، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انداز بیان کے معیار کے لحاظ سے دنیا کی بہترین کتابوں کی کوئی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی، یہ سیرۃ النبی کے سلسلہ ہی کی ایک تصنیف ہے، لیکن جس ادیبانہ اور انشاء پردازانہ خوبیوں کے ساتھ یہ لکھی گئی ہے، وہ اس کا امتیازی وصف ہے، اس کو پڑھتے وقت بڑے سے بڑا انشاء پرداز بھی محسوس کرے گا کہ اس میں کہیں انشاء پردازی کی قوس قزح نظر آ رہی ہے، کہیں اس کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے، کہیں اس کی کوثر و تسنیم

بہہ رہی ہے، کہیں زبان قلم کو چوم رہی ہے، کہیں خود قلم طرز ادا پر نچھاور ہو رہا ہے، کہیں زور بیان صاحبقرانی دکھا رہا ہے۔ ان خوبیوں کی بدولت پوری کتاب میں نبوت کا چمنستان آباد ہوگیا ہے، جس میں رسالت کے پھولوں کی روش لگی ہوئی ہے، اور روح محمدی معطر معطر ہو کر مشام جان ہو رہی ہے۔

اس کی ابتدا اس عنوان سے ہوتی ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، اس کو ثابت کرنے میں حضرت سید صاحبؒ اپنے دیدہ ورانہ اور نکتہ ورانہ مباحث میں فرماتے ہیں کہ:

”تاریخ کی دنیا میں ہزاروں لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں، جنھوں نے آنے والوں کے لیے اپنی اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں، ایک طرف شاہان عالم کے باشان و شکوہ دربار ہیں، ایک طرف سپہ سالاروں کے جنگی پرے ہیں، ایک طرف حکماء اور فلاسفروں کا گروہ ہے، ایک طرف فاتحین عالم کی پر جلال صفیں ہیں، ایک طرف شعراء کی بزم رنگین ہے، ایک طرف دولت مندوں اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدیاں اور کھنکھناتی تجوریاں ہیں، ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدمؑ کے بیٹوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے، کارتھیج کا ہنی بال، مقدونیہ کا سکندر، روم کا سیزر، ایران کا دارا، یورپ کا نپولین، ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے، سقراط، افلاطون، ارسطو، دیوجانس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکماء اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے، نمرود، فرعون، ابوجہل اور ابولہب کی دوسری شخصیتیں ہیں، قارون کی ایک الگ زندگی ہے، غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں، لیکن بتاؤ کہ ان مختلف اصناف انسانی میں کس کی زندگی نوع انسانی کی سعادت، فلاح اور ہدایت کی ضامن اور کفیل اور اس کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے؟“ (ص ۱۰ – ۱۱)

پورے اقتباس پر پر زور خطیبانہ انداز چھایا ہوا ہے، لیکن وہ اپنے اس خطیبانہ انداز سے ناظرین کو

مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اس پر مزید بحث کرتے ہوئے جدید ذہن کو مطمئن کرنے کی خاطر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ فاتح اور سپہ سالار اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے طبقے الٹ دیتے ہیں، لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت کے لیے انھوں نے کوئی نمونہ چھوڑا؟ کیا ان کی تلوار انسانی اوہام و خیالات فاسدہ کی بیڑیوں کو کاٹ سکی، کیا انسانوں کے باہمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی سلجھ سکی، انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کر سکی، روحانی مایوسیوں اور ناامیدیوں کا علاج بتا سکی دلوں کی ناپاکی اور زنگ کو مٹا سکی، اخلاق اور اعمال کا کوئی نقشہ بنا سکی؟ پھر ان سوالات کے جوابات خود ہی دیتے ہیں کہ دنیا میں بڑے بڑے شاعر بھی پیدا ہوئے، لیکن خیالی دنیا کے یہ شہنشاہ عملی دنیا میں بالکل بےکار ثابت ہوئے، حکماء اور فلاسفروں نے اپنی عقل رسا سے نظام عالم کے نقشے تو ضرور بدل دیے، لیکن وہ انسانیت کے نظام ہدایت کا کوئی عملی نقشہ پیش نہ کر سکے، بڑے بڑے بادشاہ قوموں کی جان و مال پر قابض ہوئے، ایک کو اجاڑا، دوسرے کو بسایا، ایک قوم کو گھٹایا اور دوسری کو بڑھایا، انھوں نے بازاروں اور راستوں میں امن و امان قائم کیا، لیکن دلوں کی بستی میں وہ امن و امان قائم نہ کر سکے، انھوں نے ملک کے نظم و نسق کو درست ضرور کیا، لیکن روحوں کی مملکت کا نظم و نسق ان سے درست نہ ہو سکا۔

ان مباحث کے ذریعہ وہ یہ بات دل میں نقش کرانا چاہتے ہیں کہ ہدایت اور رہنمائی کے لیے معصوم انسانوں، بےگناہ ہستیوں اور ہر حیثیت سے باکمال بزرگوں کی ضرورت ہے، اور وہ صرف انبیائے کرامؑ ہیں، اسی بات کو مستحکم دلائل کے ساتھ اس طاقت ور طرز ادا میں کہتے ہیں:

”نوحؑ کا جوش تبلیغ، ابراہیمؑ کا ولولۂ توحید، اسحاقؑ کی وراثت پدری، اسمٰعیلؑ کا ایثار، موسیٰؑ کی سعی و کوشش، ہارونؑ کی رفاقت، یعقوبؑ کی تسلیم، داؤدؑ کا غیرت حق پر قائم رہنا، سلیمانؑ کا سرود حکمت، زکریاؑ کی عبادت، یحییٰؑ کی عفت، عیسیٰؑ کا زہد، یونسؑ کا اعتراف قصور، لوطؑ کی جانفشانی، ایوبؑ کا صبر، یہی وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے ہماری روحانی و اخلاقی دنیا کا ایوان آراستہ ہے، اور جہاں

کہیں ان صفاتِ عالیہ کا وجود ہے، وہ ان ہی بزرگوں کی مثالوں اور نمونوں کا عکس ہے" (ص ۱۹-۱۸)

ایک پیراگراف میں تمام انبیائے کرامؑ کے اوصاف بیان کر دیے گئے ہیں، یہ تحریر کا بڑا اعجاز ہے، دوسرے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عالمگیر اور دائمی نمونہ عمل صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ اسلام کے پیرو اور اس کے رسول کے عاشق تھے، ان کو یہی کہنا چاہیے، لیکن اس کے لیے جو دلائل دیے ہیں وہ غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں، وہ رقمطراز ہیں:

"یوں تو ہر پیغمبر خدا کا شاہد، داعی، مبشر اور نذیر بن کر اس دنیا میں آیا ہے، مگر یہ کل صفتیں سب کی زندگی میں عملاً یکساں نمایاں ہو کر ظاہر نہیں ہوئیں، بہت سے انبیاءؑ تھے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوئے، جیسے حضرت یعقوبؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت اسمٰعیلؑ وغیرہ، بہت سے ایسے تھے جو نمایاں طور پر مبشر بنے جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ، بہت سے ایسے تھے جن کا خاص وصف نذیر تھا، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، بہت سے ایسے تھے جو امتیازی حیثیت سے داعیٔ حق تھے، جیسے حضرت یوسفؑ، حضرت یونسؑ، لیکن وہ جو شاہد، مبشر، نذیر اور داعی، سراج منیر سب کچھ بیک وقت تھا، اور جس کے مرقع حیات میں یہ سارے نقش و نگار عملاً نمایاں تھے، وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اور یہ اس لیے کہ آپؐ دنیا کے آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، جس کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، آپؐ ایسی شریعت لے کر بھیجے گئے جس کی تکمیل کے لیے پھر کسی دوسرے کو نہ آنا تھا۔"

سید صاحبؒ کو یہ احساس تھا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ دعویٰ ذاتی مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر کیا گیا ہے، اس لیے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ غور و فکر کے لائق ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں کہ ایک آئیڈیل سیرت کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ اس کے جو سوانح بیان کیے جائیں وہ تاریخ اور روایت کے لحاظ سے مستند ہوں، محض فرصت کے گھنٹوں میں دلچسپی کے لیے بیان نہیں کیے جائیں، بلکہ وہ دوسروں

کی زندگی کے لیے نمونہ بنیں، اسلامی روایت کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے، مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں، اور جتنوں کے نام جانتے بھی ہیں ان کا حال کیا جانتے ہیں، سب سے زیادہ قدیم اور پرانے ہونے کا دعویٰ ہندوؤں کو ہے، لیکن ان میں بہتیروں کے تو نام کے سوا کسی چیز کا ذکر تاریخ میں نہیں، میتھالوجی میں ہے، ایران کے پرانے مجوسی مذہب کا بانی زرتشت ہے، مگر اس کی تاریخی شخصیت قدامت کے پردہ میں ہے، بعض امریکی اور یورپی محققین تو اس کے وجود کے منکر ہیں، گوتم بدھ کی زندگی اور سیرت تاریخ کی روشنی میں ماند پڑ جاتی ہے، کنفیوشس کی نسبت تو گوتم بدھ سے بھی کم معلومات ہیں، سامی قوم میں سینکڑوں پیغمبر آئے، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ کے حالات پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے نام کے سوا تاریخ نے کچھ اور حال نہ جانا، حضرت موسیٰؑ کا حال توراۃ سے ضرور معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ حضرت موسیٰؑ کے صدہا سال کے بعد وجود میں آئی، اس لیے اس کے سوانح و واقعات میں بہت تضادات پائے جاتے ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے حالات انجیلوں میں درج ہیں، مگر ان بہت سی انجیلوں میں آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ہے، ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے بھی لکھنے والے نے حضرت عیسیٰؑ کو خود نہیں دیکھا تھا، انھوں نے کسی سے سن کر یہ حالات کا مجموعہ تیار کیا، یہ نہیں معلوم اور نہ ہی یہ ثابت ہے کہ پہلے یہ کس زبان میں لکھی گئی، ان مباحث کے غوامض اور حقایق پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"جس سیرت کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو آئیڈیل لائف اور قابلِ تقلید زندگی کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان اس کی کس چیز کی نقل کرے گا اور کس عمل سے سبق حاصل کرے گا، ہم کو تو صلح و جنگ، فقر و دولت، ازدواج و تجرد، تعلقات خداوندی، تعلقات عباد، حاکمیت، محکومیت، سکون، غضب، جلوت، خلوت، غرض زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے، دنیا کا بیشتر بلکہ تمام تر حصہ ان ہی مشکلات

اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے، اس لیے لوگوں کو ان ہی مشکلات کو حل کرنے اور ان ہی تعلقات کو بوجہ احسن انجام دینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے تو لی نہیں، لیکن یہ کہنا شاعری اور خطابت نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس معیار پر سیرت محمدیؐ کے سوا کوئی دوسری سیرت پوری نہیں اتر سکتی۔" (ص ۱۴۱)

پھر لکھتے ہیں کہ آئیڈیل لائف اور نمونۂ تقلید بننے کے لیے جو حیات انسانی منتخب کی جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سیرت میں یہ چار باتیں پائی جائیں، تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت، ان ہی کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

تاریخیت کے باب میں ایک بہت ہی پُر مغز بحث کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ آپؐ کی سیرت مبارکہ کا سب سے اہم، مستند اور صحیح ماخذ تو خود قرآن پاک ہے، جس میں قبل نبوت کی زندگی، یتیمی، غربت، تلاش حق، نبوت، وحی، اعلان، تبلیغ، معراج، مخالفین کی دشمنی، ہجرت، لڑائیاں، وقایع، اخلاق، سب اس میں موجود ہیں، دوسرا ماخذ احادیث ہیں، جو ایک لاکھ کے قریب ہیں، جن میں صحیح الگ، کمزور الگ اور جعلی الگ ہیں، صحاح ستہ کا سرمایہ ہے، جس کا ایک ایک واقعہ تولا اور پرکھا ہوا ہے، تیسرا ماخذ مغازی ہیں یعنی وہ کتابیں جن میں زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف غزوات اور لڑائیوں کا حال ہے ضمناً اور واقعات بھی موجود ہیں، چوتھا ماخذ عام تاریخ کی کتابیں ہیں، ان میں سب سے زیادہ معتبر اور مبسوط طبقات ابن سعد اور تاریخ الرسل والملوک امام ابو جعفر طبریؒ، تاریخ صغیر و کبیر امام بخاریؒ، تاریخ ابن حبانؒ ہیں، پانچواں ماخذ آپؐ کے معجزات اور روحانی کارناموں کا وہ دفتر ہے جن کو کتب دلائل کہتے ہیں، چھٹا ماخذ کتب شمائل ہیں، یعنی وہ کتابیں جو صرف آپؐ کے اخلاق و عادات و خصائل اور معمولات زندگی پر لکھی گئی ہیں، ان ماخذوں کے علاوہ وہ کتابیں بھی ہیں جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات میں ہیں، ان میں آپؐ کے حالات بھی ضمناً آگئے ہیں، ان ماخذوں کے بیان کرنے میں ساری کتابوں کے نام بھی بتا دیے گئے ہیں جو سیرت پر کام کرنے والوں کے لیے مفید ہو سکتی ہیں، ان تفصیلات کے قلمبند کرنے کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی گئی ہے کہ یہ تاریخیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نبی کے حصہ میں نہیں آئی۔

کاملیت کے عنوان سے یہ بتایا گیا ہے کہ کسی زندگی کا کامل اور ہر نقص سے بری ہونا اُس وقت تک ثابت نہیں ہوتا، جب تک اس کی زندگی کے تمام اجزاء ہمارے سامنے نہ ہوں، پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا ہر لمحہ پیدایش سے لے کر وفات تک آپؐ کے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اور آپؐ کی وفات کے بعد تاریخ عالم کے سامنے ہے، آپؐ کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا، جب آپؐ اپنے اہل وطن کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر آیندہ زندگی کی تیاری میں مصروف ہوں، آپؐ خلوت میں ہوں یا جلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، نماز شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستگی میں، منبر پر ہوں یا گوشۂ تنہائی میں، ہر وقت ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظر عام پر لائی جائیں، ازواج مطہراتؓ آپؐ کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں، اسی لیے سیرت محمدیؐ دنیا کا آئینہ خانہ ہے جس میں دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم و روح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور و طریق کی اصلاح و درستی کر سکتا ہے، یہی آپؐ کی کاملیت کی دلیل ہے۔

جامعیت کے عنوان سے جو مباحث ہیں، ان کا پورا مطالعہ کرنے کے بجائے اگر اس کتاب کے حسب ذیل ٹکڑے پڑھ لیے جائیں تو نہ صرف ساری چیزیں واضح ہو جائیں گی، بلکہ سیرت پاک کا اعلیٰ ترین اور ارفع ترین نقشہ ذہن میں منقوش ہو جائے گا، ان ٹکڑوں کو پڑھتے وقت لکھنے والے کے قلم کی شوکت، سطوت اور حشمت سے بھی محظوظ ہونا چاہیے:

"ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اگر دولتمند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور

مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہو تو معرکہ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو، تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی و بیکسی کے عالم میں حق کے منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرہ کے کارواں میں سالار تجارت کا اسوہ ڈھونڈو، اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو، جو حجر اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو، جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے، اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو فاطمہ کے باپ اور حسن و حسین کے نانا کا حال پوچھو، غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لیے نمونہ تمہاری سیرت کی درستگی و اصلاح کے لیے تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہر دم مل سکتا ہے، اس لیے طبقۂ انسانی کے طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے، جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اس کے سامنے نوحؑ، ابراہیمؑ، ایوبؑ، یونسؑ، موسیٰؑ اور

عیسیٰ علیہم السلام سب کی سیرتیں ہیں، گویا تمام دوسرے انبیائے کرام کی سیرتیں ایک ہی جنس کی اشیاء کی دوکانیں ہیں، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اخلاق اور اعمال کی دنیا کا سب سے بڑا بازار ہے، جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلبگار کے لیے بہترین سامان موجود ہے" (ص ۹۰ - ۹۷)

یہ عبارت وہی لکھ سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام جزوی اور تفصیلی واقعات نظر میں رکھتا ہو، پھر اس اختصار میں کیسی جامعیت ہے، اب اقتباس پڑھنے کے بجائے سید صاحبؒ ہی کی پوری عبارت کا سہارا لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت یہ دکھا کر ثابت کی جاسکتی ہے کہ آپؐ میں تمام انبیائے کرام کے اوصاف موجود تھے، اس کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ "مکہ کے پیغمبر کو جب مکہ سے یثرب جاتے دیکھو تو کیا وہ پیغمبر تم کو یاد نہ آئے گا جو مصر سے مدین جاتا نظر آتا ہے، کوہ حرا کے خانہ نشین اور کوہ سینا کے تماشائی میں ایک حیثیت سے کیسی یکسانی نظر آتی ہے، مگر جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی آنکھیں کھلی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بند، حضرت موسیٰؑ باہر دیکھ رہے تھے اور آنحضرتؐ اندر، کوہ زیتون پر وعظ کہنے والے پیغمبر یعنی حضرت عیسیٰؑ اور کوہ صفا پر چڑھ کر یا معشر قریش کہہ کر پکارنے والے میں کتنی مشابہت ہے، بدر و حنین اور احزاب و تبوک والے سپہ سالار اور موابیوں، عمونیوں اور اموریوں سے نبرد آزما پیغمبر حضرت موسیٰؑ میں کس قدر مماثلت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سات سرداروں کے حق میں بددعا کی تو آپؐ کی زندگی حضرت موسیٰؑ کے مثل تھی، جب انھوں نے ان فرعونیوں پر بددعا کی جو معجزات پیہم معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے، اور جب آپ نے احد میں اپنے قاتلوں اور دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کی تو اس وقت گویا آپ حضرت عیسیٰؑ کے قالب میں تھے جنھوں نے کبھی اپنے دشمنوں کا بھی برا نہ چاہا، جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تم مسجد نبویؐ کی عدالت گاہ اور پنچایتوں میں یا غزوات اور لڑائیوں میں دیکھو تو حضرت موسیٰؑ کی سیرت کا نقشہ کھنچ جائے گا، لیکن جب آپ کو مکانوں کے حجروں، پہاڑوں کے غاروں، رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دیکھو تو حضرت عیسیٰؑ کا جلوہ نظر آئے گا، شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں آپؐ کی زبان مبارک کی دعاؤں،

اور مناجاتوں کو سنو تو زبور والے داؤدؑ کا ہم کو دھوکہ ہوگا، فتح مکہ کے خدم وحشم اور بیرق وعلم کے سایہ میں آپؐ کو دیکھو تو تزک و احتشام اور فوجوں والے سلیمانؑ کا مغالطہ ہوگا، اگر شعب ابی طالب میں آپؐ کو تین برس اس طرح محصور دیکھو کہ کھانے کا سامان تک بھی وہاں نہ پہونچ سکے تو مصری قید خانہ کے پیغمبر یوسفؑ کا جلوہ دکھائی دے گا، غرض ؎

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، ید بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"

یہ پورا باب اسی پرشکوہ عبارت آرائی سے پُر ہے، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، صولت اور دبدبہ بھی دل پر نقش ہو جاتا ہے۔

عملی پہلو یا عملیت کے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ بحیثیت ایک عملی پیغمبر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک در حقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے جو حکم آپؐ پر اتارا گیا، آپؐ نے خود اس کو کر کے بتایا، ایمان، توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، جہاد، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، صبر، شکر، ان کے علاوہ حسن عمل اور حسن خلق کی باتیں جس قدر آپ نے فرمائیں ان کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا نمونہ پیش فرمایا، جو کچھ قرآن میں تھا وہ سب مجسم ہو کر آپؐ کی زندگی میں نظر آیا۔ (ص ۱۲۱)

اسی ایجاز کا اطناب پورا باب ہے، جس میں زبان وبیان کے پورے زور اور لطف کے ساتھ آپؐ کی زندگی کے خاص خاص واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کو اجمالی طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی تو خود اس پر عمل کر دکھایا، شب و روز میں کم کوئی لمحہ ایسا تھا جب آپؐ کا دل خدا کی یاد سے اور آپؐ کی زبان خدا کے ذکر سے غافل ہو، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی، آپؐ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا، مگر خود آپؐ کا کیا حال تھا، عام پیرووں کو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا، مگر خود آپؐ آٹھ وقت نماز پڑھتے، تہجد کی نماز عام مسلمانوں کے لیے معاف ہو گئی تھی، مگر آپؐ اس کو بھی تمام عمر

ہر شب ادا فرماتے رہے، پھر کیسی نماز کہ رات بھر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے، پائے مبارک میں ورم آ جاتا، حضرت عائشہؓ عرض کرتیں کہ اللہ نے آپؐ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے، پھر اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں، فرماتے: یہ نماز خشیت الٰہی سے نہیں ہے، بلکہ محبت الٰہی اس کا منشا ہے، رکوع میں اتنی دیر تک جھکے رہتے کہ دیکھنے والے سمجھتے کہ آپ شاید سجدہ کرنا بھول گئے،

آپؐ نے روزہ کا حکم دیا، عام مسلمانوں پر سال کے تیس ۳۰ دن کے روزے فرض ہیں، مگر خود آپؐ کی کیا کیفیت تھی، کوئی ہفتہ، کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا، سال میں دو ۲ مہینے شعبان اور رمضان پورے کے پورے روزے میں گذرتے تھے، ہر مہینہ کے ایام بیض یعنی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخوں میں اکثر روزے رکھتے تھے۔

آپؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ وخیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا، جو کچھ آتا خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے، ایک موقع پر فرمایا: اگر احد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور اس میں ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ رکھ چھوڑوں۔

آپؐ نے زہد وقناعت کی تعلیم دی، لیکن اس راہ میں آپؐ کا طرز عمل یہ تھا کہ امیر گھر میں فقر تھا فاقہ تھا، آپؐ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ حضور اس دنیا سے تشریف لے گئے، مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپؐ کو کھانا نصیب نہ ہوا، انہی کا بیان ہے کہ جب آپؐ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لیے تھوڑے سے جو کے سوا کچھ موجود نہ تھا، چند سیر جو کے بدلہ میں آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی، خدا پر اعتماد اور توکل کی شان کی تو بہت سی مثالیں دی گئی ہیں، لیکن صرف اس پیراگراف سے یہ پوری شان ظاہر ہو جائے گی:

"تم کو کسی اور ایسے سپہ سالار کا حال بھی معلوم ہے جس کی بہادری اور استقلال کا یہ عالم ہو کہ فوج

کتنی ہی کم ہو، کتنی ہی غیر مسلح ہو، وہ اس کو چھوڑ کر پیچھے بھی کیوں نہ ہٹ گئی ہو، مگر وہ نہ تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے، اور نہ اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتا ہے، بلکہ ہر حال میں زمین کی طاقتوں سے غیر مسلح ہوکر آسمان کی طاقتوں سے مسلح ہونے کی درخواست کرتا ہے۔" (ص ۱۳۶)

آپ دشمنوں سے پیار کرنے کی نصیحت کرتے ہیں اور اس کے جو عملی نمونے پیش کیے ہیں ان کی بہت سی مثالیں اس کتاب میں دی گئی ہیں، مندرجۂ ذیل مثال دینے میں جو طرز ادا ہے اس سے اس مثال کی اثر پذیری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے:

”عکرمہ، اسلام، مسلمانوں اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن تھے، یعنی ابوجہل کے بیٹے تھے جس نے آپ کو سب سے زیادہ تکلیفیں پہونچائیں، وہ خود بھی اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑ چکے تھے، مکہ جب فتح ہوا تو ان کو اپنے اور اپنے خاندان کے تمام جرم یاد تھے، وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان چکی تھیں، وہ خود یمن گئیں، عکرمہ کو تسکین دی، ان کو لے کر مدینہ آئیں، حضورؐ کو ان کی آمد کی خبر ہوئی تو ان کے خیر مقدم کے لیے اس تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر تک نہیں رہتی، پھر جوش مسرت میں فرماتے ہیں مرحبا بالراکب المهاجر، اے مہاجر سوار تمہارا آنا مبارک ہو، غور کرو مبارکباد کس کو دی جا رہی ہے، یہ خوشی کس کے آنے پر ہے، یہ معافی نامہ کس کو عطا ہو رہا ہے، اس کو جس کے باپ نے آپ کو مکہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں پہونچائیں، اس نے جس نے آپ کے جسم مبارک پر نجاست ڈالی جس نے بحالت نماز آپ پر حملہ کرنا چاہا، جس نے آپ کے گلے میں چادر ڈال کر آپ کو پھانسی دینی چاہی، جس نے دار الندوہ میں آپ کے قتل کا مشورہ دیا، جس نے بدر کا معرکہ برپا کیا، ہر قسم کی صلح کی تدبیر کو برہم کیا، آج اسی کی جسمانی یادگار کی آمد پر مسرت و شادمانی ہے۔" (ص ۱۳۹)

اس ٹکڑے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی پریشانیاں بھی سامنے آجاتی ہیں، اپنے ٹکڑے

اس باب میں بہت ملیں گے۔

حضرت سید صاحبؒ کے قلم کی گلفشانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق الٰہی کی جو مرقع آرائی کی گئی ہے اس سے ذرا لطف اندوز ہوں:

”حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھتے ہیں تو بے تابانہ زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: ایلی ایلی لما سبقتنی اے میرے خداوند! اے میرے خداوند! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب موت کے بستر پر ہوتے ہیں اور زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوتے ہیں تو زبانِ مبارک پر یہ کلمہ ہوتا ہے: اللّٰھمّ الرفیق الاعلیٰ! اے میرے خداوند، اے میرے بہترین ساتھی! ان دونوں فقروں میں کس میں محبت کا ذائقہ، عشق کی چاشنی اور ربانی سکینت کا لطف ہے۔" (ص ۱۴۸ - ۱۴۷)

کتاب کا ساتواں باب 'پیغمبر علیہ السلام کا پیغام' کے عنوان سے ہے، اس میں بڑے عالمانہ اور منطقیانہ دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام انبیاء کے پیغامات کسی خاص زمانہ اور قوم کے لیے تھے، وقتی تھے، دائمی نہ تھے، اس لیے ان کی حفاظت نہ ہو سکی، ان کی اصل برباد ہو گئی، ان کا مٹنا اور برباد ہو جانا ان کے وقتی زمان اور عارضی تعلیم ہونے کا ثبوت ہے، توراۃ میں ہے کہ ایک اور نبی موسیٰؑ کے مثل آنے والا ہے، جو اپنے ساتھ ایک آتشیں شریعت بھی لائے گا، انجیل میں لکھی ہے کہ وہ خدا کا آخری کلام نہیں، اور نیز یہ بھی کہ مسیح کامل بھی نہیں، ایک اور آئے گا جو مسیحؑ کے پیغام کی تکمیل کرے گا، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اپنے بعد کسی اور آنے والے کا پیغام نہیں دیتا جو نیا پیغام سنائے گا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں کوئی نقص ہے جس کو دور کرکے وہ اس کو کامل کرے گا، خداوند تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر پوری کر دی اپنی نعمت اور پھر بتایا کہ محمد خاتم الانبیاء ہیں، یعنی نبوت کے

سلسلہ کو بند کرنے والے، سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

"پیغام محمدیؐ دنیا میں خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے، جو کالے گورے، عرب، عجم، ترک، تاتار، ہندی، چینی زنگ اور فرنگ سب کے لیے عام ہے، جس طرح اس کا خدا تمام دنیا کا خدا ہے، الحمد للہ رب العلمین یعنی وہ تمام دنیا کا پروردگار ہے، اسی طرح اس کا رسول بھی تمام دنیا کا رحمت للعلمین ہے، یعنی تمام دنیا کے لیے رحمت ہے، اس کا پیغام بھی تمام دنیا کے لیے پیغام ہے۔" (ص ۱۵۳)

اس بات کو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت کیا ہے، پھر فرماتے ہیں:

"ہر مذہب کے دو جزو ہیں، ایک کا تعلق انسان کے دل سے، اور دوسرے کا انسان کے باقی جسم اور مال و دولت سے ہے، پہلے کو ایمان اور دوسرے کو عمل کہتے ہیں، عمل کے تین حصے ہیں، ایک خدا سے متعلق ہے جس کو عبادات کہتے ہیں، دوسرا انسان کے باہمی کاروبار سے متعلق ہے جس کو معاملات کہتے ہیں، اور جن کا بڑا حصہ قانون ہے، انسان کے باہمی تعلقات اور روابط کی بجاآوری ہے، اس کو اخلاق کہتے ہیں، غرض اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاق مذہب کے یہی چار جزو ہیں، اور یہی چاروں جزو پیغام محمدیؐ کے ذریعہ سے تکمیل کو پہونچے ہیں۔" (ص ۱۵۵)

اس دعویٰ کے ثبوت میں موجودہ توراۃ اور انجیل کی تعلیمات کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ ان چاروں اجزاء سے متعلق ان کی تعلیمات یا تو بالکل خالی ہیں، یا اگر ہیں تو ناصاف، غیر واضح، تشریح طلب اور سلبی ہیں، ان کے مقابلہ میں اسلامی تعلیمات بڑی تصریح کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، سب سے پہلے انسانیت کا مسئلہ آتا ہے، اس کی وضاحت اسلام میں پورے طور پر کی گئی ہے، اس کو سید صاحبؒ ہی کی تحریر کے ذریعہ سے سمجھیں، وہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا مسئلہ جو پیغام محمدی کے ذریعہ سے سامنے آیا، وہ کائنات اور مخلوقات الٰہی میں انسانیت کا درجہ ہے، اور یہی توحید کی جڑ ہے، اسلام سے پہلے انسان اکثر مخلوقات الٰہی سے اپنے کو کم درجہ اور کم رتبہ سمجھتا تھا، وہ سخت پتھر، اونچے پہاڑ، بہتے دریا، سرسبز درخت، برستے پانی، دہکتی آگ، ڈراونے جنگل، زہریلے سانپ، ڈکارتے شیر، دودھ دینے والی گائے، چمکتے سورج، درخشاں تاروں، کالی راتوں، بھیانک صورتوں، غرض دنیا کی ہر اس چیز کو جس سے وہ ڈرتا تھا، یا جس کے نفع کا خواہشمند تھا، پوجتا تھا، اور اس کے آگے اپنی عبودیت کا سر جھکاتا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا کہ اے لوگو! یہ تمام چیزیں تمہاری آقا نہیں بلکہ تم ان کے آقا ہو، وہ تمہارے لیے پیدا کی گئی ہیں، تم ان کے لیے پیدا نہیں کیے گئے، وہ تمہارے آگے جھکی ہیں، تم کیوں ان کے آگے جھکتے ہو، انسانو! تم اس ساری کائنات میں خدا کے نائب اور خلیفہ ہو، اس لیے یہ ساری مخلوقات اور کائنات تمہارے زیر فرمان کی گئی ہے، تم اس کے زیر فرمان نہیں کیے گئے، وہ تمہارے لیے ہے، تم اس کے لیے نہیں ہو۔" (ص ۱۶۱ ـ ۱۶۰)

یہ کوئی بڑا فلسفی ہی بیان کر سکتا ہے، لیکن یہ محض فلسفہ نہیں، بلکہ سید صاحبؒ نے ان باتوں کو کلام پاک اور احادیث کے ذریعہ سے ثابت کیا ہے، اس لیے ان مواعظ میں فلسفیانہ رنگ پیدا ہوگیا ہے اور پھر جس زور بیان سے یہ کہا گیا ہے، وہ اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا اصولی اور بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان اصل خلقت میں پاک اور بے گناہ ہے، اس کی فطرت کی لوح بالکل سادہ اور بے نقش ہے، وہ اپنے اچھے اور برے عمل سے فرشتہ یا شیطان یعنی بے گناہ یا گنہگار بن جاتا ہے، یہ سب سے بڑی خوشخبری اور بشارت ہے جو بنی نوع انسان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی، اس سلسلہ میں سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

"چین، برما اور ہندوستان کے تمام مذہب آواگون اور تناسخ کے چکر میں مبتلا ہیں، یونان کے

بعض حکیم بھی اس خیال سے متفق ہیں، مگر اس وہم نے انسانیت کو بے کار کر دیا، اور اس کی پیٹھ پر بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے، اس کے ہر عمل کو دوسرے عمل کا نتیجہ بتا کر اس کو مجبور کر دیا، اور اس کی ہر زندگی کو دوسری زندگی کے ہاتھ میں دے دیا ہے، اس عقیدہ کے مطابق کسی انسان کا دوبارہ پیدا ہونا ہی اس کی گنہگاری کی دلیل ہے، عیسائی مذہب نے بھی انسانیت کے اس بوجھ کو کم نہیں کیا بلکہ اور بڑھا دیا ہے، عیسائی مذہب نے یہ عقیدہ تسلیم کیا ہے کہ ہر انسان اپنے باپ آدم کی گنہگاری کے سبب سے موروثی طور پر گناہ گار ہے، خواہ اس نے ذاتی طور پر گناہ نہ کیا ہو، اس لیے انسانوں کی بخشائش کے لیے ایک غیر انسان کی ضرورت ہے جو موروثی گنہگار نہ ہو، وہ اپنی جان دے کر بنی نوع انسان کے لیے کفارہ ہو جائے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر غم زدہ انسانوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ تم کو بشارت ہو کہ تم نہ اپنی پہلی زندگی اور کرم کے ہاتھوں مجبور رہنا چاہو، اور نہ اپنے باپ دادا کے گناہ کے باعث فطری گنہگار ہو، بلکہ تم فطرۃً پاک و صاف اور بے عیب ہو، اب تم خود اپنے عمل سے خواہ اپنی صفائی اور پاکی کو برقرار رکھو یا نجس و ناپاک بن جاؤ۔" (ص ۱۶۶)

اس بات کو قرآن پاک کی مختلف آیتوں سے ثابت کیا ہے، جس کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پیغام محمدیؐ نے بنی نوع انسان کو گویا یہ خوش خبری سنا دی ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی کے عمل میں بالکل آزاد ہے، ظہور محمدیؐ سے پہلے ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی، ان کے نزدیک پرمیشور صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا، خدا کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور یہیں کے بعض خاندانوں کے لیے محفوظ تھا، زرتشت، خاک پاکِ ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں خدا کی آواز نہیں سنتا تھا، بنی اسرائیل اپنے خاندان سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے، اس کے بعد سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پیغام ہے کہ ساری دنیا ایک ہی خدا کی مخلوق ہے، اور خدا کی نعمتوں میں ساری قومیں اور نسلیں برابر کی شریک ہیں، ایران ہو، ہندوستان ہو، چین ہو یا یونان، عرب ہو یا شام، ہر جگہ خدا کا نور یکساں چمکا، جہاں جہاں بھی انسانوں کی آبادی تھی خدا نے اپنے قاصد بھیجے، اپنے رہنما اتارے اور ان کے ذریعہ اپنے احکام سے سب کو مطلع فرمایا، اسلام کی اس تعلیم کا نتیجہ ہے کہ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک دنیا کے تمام پیغمبروں پر، پہلی آسمانی کتابوں اور گذشتہ ربانی الہاموں پر یقین نہ رکھے، جن جن پیغمبروں کے نام قرآن میں ہیں ان کو نام بنام اور جن کے نام نہیں معلوم یعنی قرآن نے نہیں بتائے ہیں، وہ کہیں بھی گذرے ہوں، اور ان کے جو نام بھی ہوں، ان سب کو سچا اور وارث بانا ماننا ضروری ہے۔" (ص ۱۶۹)

اس بات کو بھی قرآن پاک کی آیتوں سے اور زیادہ صاف کیا ہے جس کے بعد یہ تعین کر دیا ہے کہ روحانی مسرت، انسانی اخوت و برادری اور تمام سچے مذہبوں، رہنماؤں اور پیغمبروں کے اس حقیقی ادب و تعلیم اور ان کی یکساں صداقت کا سبق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور نے نہیں دیا، اس طرح پیغمبر اسلامؐ کی رحمت عام، ہمدردی اور دادرسی کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام مذہبوں نے عبد و معبود اور خدا و بندہ کے درمیان واسطے قائم کر رکھے تھے، ہندوؤں کے یہاں کاہن اور پجاری تھے، یہودیوں نے بنی لاوی اور ان کی نسل کو خدا اور بندہ کے درمیان عبادتوں اور قربانیوں میں واسطہ بنایا تھا، عیسائیوں نے پوپوں کو یہ رتبہ دیا تھا کہ وہ جو زمین پر باندھیں گے وہ آسمان پر باندھا جائے گا، اور جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، مگر اسلام میں پجاریوں، کاہنوں، پوپوں اور پادریوں کی کوئی جگہ نہیں رکھی گئی، محمد رسول اللہ صلعم کی اس تعلیم کو حضرت سید صاحبؒ نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

"اسلام میں عبد و معبود اور خدا و بندہ کی عبادت اور راز و نیاز میں کسی غیر کو دخل نہیں،

ہر شخص جو مسلمان ہے، نماز کا امام ہو سکتا ہے، قربانی کر سکتا ہے، نکاح پڑھا سکتا ہے، مذہب کے تمام مراسم بجا لا سکتا ہے، یہاں انسانوں کو اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (اے لوگو! بلاواسطہ مجھے پکارو، میں تم کو جواب دوں گا) کی صدائے عام ہے، ہر شخص اپنے خدا سے باتیں کر سکتا ہے، اپنی دعاؤں میں اس کو پکار سکتا ہے، اس کے آگے جھک سکتا ہے، اور دل کی عقیدت کے نذرانے بے واسطہ پیش کر سکتا ہے، یہاں عبد و معبود اور خدا و بندہ کے درمیان کوئی متوسط اور دخیل نہیں، یہ سب سے بڑی آزادی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں کو عطا ہوئی، یعنی خدا کے معاملہ میں انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات ملی، ہر انسان اپنا آپ کاہن، برہمن، پریسٹ اور پوپ ہے۔" (ص ۷۲ - ۱۷۱)

پیغام محمدیؐ سے پہلے انسانوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے جو مقدس ہستیاں آئیں ان کو خود خدا یا خدا کا مثل یا خدا کا روپ اور مظہر یا اوتار یا خدا کا بیٹا ٹھہرایا گیا، لیکن اسلام کا کیا پیام ہے؟ وہ سید صاحبؒ ہی کی زبانی سنیے:

"اسلام نے اس منصب عظیم کی صحیح حیثیت مقرر کی، اور بتایا کہ انبیاء نہ خدا ہیں اور نہ خدا کے مثل ہیں، نہ خدا کے اوتار ہیں، نہ خدا کے بیٹے اور رشتہ دار ہیں، وہ آدمی ہیں اور محض آدمی ہیں، وہ بشر ہیں اور خالی بشریت کے جامہ میں ہیں، تمام انبیاء بشر تھے، اور آخری پیغمبر نے خود اپنے متعلق کہا کہ میں بشر ہوں..... خدا کے کارخانہ میں کوئی چیز بالذات انبیاءؑ کے اختیار میں نہیں، ان کو بالذات کسی مافوق طاقتِ بشری کام پر قدرت نہیں، انھوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کے اذن و اشارہ سے کیا۔"

(ص : ۱۷۳)

لیکن اسی کے ساتھ انبیاءؑ کی خصوصی عظمت بھی ہے، جس کی تصریح سید صاحبؒ نے اس طرح کی ہے کہ:

"وہ گو انسان اور بشر ہیں، لیکن اپنے کمالات کی حیثیت سے تمام انسانوں سے مافوق ہیں،

وہ خدا سے مکالمہ کرتے ہیں، ان پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے، وہ بے گناہ اور معصوم ہوتے ہیں، تاکہ گنہگاروں کے لیے نمونہ بنیں، ان کے ہاتھوں سے خدا اپنے اذن اور اشارہ سے اپنی قدرت کے عجائبات دکھاتا ہے، وہ لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتے ہیں، ان کی عزت، تعظیم اور اطاعت سب پر فرض ہے، وہ خدا کے خاص سچے اور مطیع بندے ہیں، جن کو خدا تعالیٰ اپنی رسالت اور پیغمبری کے منصب سے سرفراز کرتا ہے۔" (ص ۱۷۳)

اس تعلیم میں بڑا اعتدال ہے، اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے، یہی توحید کی اصل تعلیم بھی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ذریعہ سے توحید کی جتنی تکمیل ہوئی کسی اور مذہب سے نہیں ہو سکی۔

آٹھویں باب کا عنوان "عمل" ہے، جس میں عالمانہ رنگ کے ساتھ بڑی فلسفیانہ اور متکلمانہ بحثیں ہیں، اگر ان کو غور سے پڑھا جائے تو دل کی بہت سی گرہیں اور ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو سکتی ہیں، پورا باب گویا توحید کے غوامض اور حقائق سے بھرا ہوا ہے، لیکن ان کو بہت ہی سلیس پیرایۂ بیان میں سمجھایا گیا ہے، جس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ہے، پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ خدا کو خدا کی صفتوں اور خدا و بندہ کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں دوسرے مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں تو اصل خدا جاتا رہا، اور اس کی جگہ یہ تشبیہیں اور تمثیلیں خدا بن گئیں، ان ہی تشبیہوں اور تمثیلوں نے مجسم ہو کر بتوں کی شکل اختیار کر لی، آرین قوموں میں چونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اس لیے خدا اور بندہ کے تعلق کو ماں اور بیٹے کے لفظ سے ادا کیا گیا، اس لیے خدا ماتا کی شکل میں آ گیا، بنی اسرائیل کے ابتدائی تخیل میں خدا باپ اور تمام فرشتے اور انسان اس کی اولاد بنائے گئے، ان کے بعض صحیفوں میں زن و شو کا بھی تخیل پیش کیا گیا ہے، بنی اسرائیل اور یروشلم بیوی فرض کیے جاتے تھے، عیسائیوں میں باپ اور بیٹے کی تمثیل نے اصلیت اور حقیقت کی جگہ لے لی، پیغام محمدیؐ نے ان تمام تشبیہی اور تمثیلی صورتوں، طریقوں اور محاوروں کو یک قلم موقوف کر دیا اور پھر سورۂ اخلاص کے ذریعہ سے انسانوں کے سارے توہمات، تشبیہات، اور

تمثیلات کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

حضرت سید صاحبؒ نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تین ۳ بڑی صفتیں ہیں خالقیت، قیومیت اور ممیتیت، ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا، اور برہما، وشنو اور شیو، یعنی خالق، قیوم اور ممیت تین مستقل ہستیاں بن گئیں اور برہمن وشنو پرست اور شیو پرست تین الگ الگ فرقے بن گئے، اور تینوں کے پوجنے والے الگ ہو گئے، عیسائیوں نے خدا کی تین ۳ بڑی صفتوں یعنی حیات، علم، اور ارادہ کو تین ۳ مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا، حیات باپ ہے، علم روح القدس ہے، اور ارادہ بیٹا ہے، اس قسم کی چیزیں رومی، یونانی اور مصری تخیل میں بھی ملتی ہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے اس غلطی کا پردہ چاک کیا، اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی جہالت اور نادانی قرار دیا، پھر قرآن کی آیتوں سے یہ دکھایا کہ سب خوبیاں اسی ایک پروردگار عالم کے لیے ہیں، سب اچھی صفتیں اسی کے لیے ہیں، وہی آسمان و زمین کا نور ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے، (وہی برہما ہے، وہی شیو ہے، وہی وشنو ہے، تینوں ایک ہی کی صفتیں ہیں، صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں، ان صفتوں والے خدا کو ہم نے صرف پیغام محمدیؐ ہی کے ذریعہ سے جانا ہے۔

جو لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کام کے الگ الگ سینکڑوں دیوتا یا خدا ہیں تو اسلام نے ان نادانوں کو یہ بتایا کہ یہ سب ایک ہی خدا کے کام ہیں، تمام افعال کی دو ۲ بڑی قسمیں ہیں، ایک خیر اور ایک شر، زرتشتوں نے خیر اور اچھے کاموں کے لیے ایک خدا اور شر یعنی برے کاموں اور بری چیزوں کے لیے الگ خدا ٹھہرایا، پہلے کا نام یزداں اور دوسرے کا اہرمن رکھا، اور دنیا کو اس یزداں اور اہرمن کی باہمی کشمکش کا معرکہ گاہ ٹھہرایا، مگر پیغام محمدیؐ یہ ہے کہ تمام دنیا کی اچھی بری چیزوں کا وہی ایک خالق ہے، اس کے سوا کوئی اور اللہ نہیں، اب کسی انسان نے کسی چیز کا صحیح مصرف لیا تو یہ خیر ہے اور غلط طریقہ پر استعمال کیا تو یہ شر ہے،

ورنہ کوئی چیز اپنی اصل کی رو سے ہدایت ہے نہ ضلالت، خیر ہے نہ شر، اس لیے خیر و شر کو دو ۲ چیزیں سمجھ کر دو ۲ خداؤں کی ضرورت نہیں، بلکہ ایک ہی خدا ہے جو اُن دونوں کا خالق ہے، اس طرح توحید کا جلوہ اس تصرف سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔

قدیم مذاہب میں عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا تھا، یعنی ظاہر جسم کو جس قدر زیادہ تکلیف دی جائے گی، اسی قدر روحانی ترقی ہوگی، اسی لیے ہندوؤں میں جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہو گئی، پیغام محمدیؐ میں اس قسم کی تعلیم نہیں ہے، بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت کی گئی ہے، اس کی تعلیم ہے کہ خدا کو جسم کی تکلیف پسند نہیں، بلکہ دل کا رنگ مرغوب ہے، یعنی انسان کی اصلی عبادت اور ریاضت یہ ہے کہ وہ خدا کا سرکش نہ ہو، اس کا فرماں بردار ہو، اس میں تقویٰ ہو، ناپسندیدہ باتوں سے پرہیز کرتا ہو، اس کا دل صاف ہو، غریبوں کی مدد کرتا ہو، اپنی اولاد اور ازواج کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک سمجھتا ہو۔

پہلے قربانی بھی ایک عبادت سمجھی جاتی تھی، اس لیے نہ صرف جانوروں کی قربانی دی جاتی، بلکہ خودکشی، دختر کشی، اولاد کو بھینٹ چڑھا دینا، ان کو کسی دیوتا کے سامنے مار ڈالنا، یا شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کا ستی ہو جانا، یہ سب عبادت میں شمار کیے جاتے تھے، پیغام محمدیؐ نے ان سب کی بیخ کنی کر دی۔

اور مذاہب نے خدا کے بندوں کے درمیان حسب و نسب، مال و دولت، رنگ روپ، صورت و شکل کی دیواریں قائم کر دی تھیں، ہندوستان نے ابتدا سے آج تک اپنے سوا سب کو ملیچھ اور ناپاک قرار دیا، اور خود کو چار ۴ ذاتوں میں تقسیم کر کے ان میں عزت اور حقوق کی ترتیب قائم کی، شودروں کو مذہب کا بھی حق نہ تھا، قدیم ایران میں چار ۴ ذاتیں تھیں، رومنس نے اپنے کو آقائی اور اپنے سوا سب قوموں کو غلامی کے لیے مخصوص کر لیا، بنی اسرائیل نے صرف اپنے آپ کو خدا کی اولاد قرار دیا، اور

سب کو چنڈال سمجھا، خود یورپ میں کالے گورے کی تفریق ہے اور سپید آدمی ہی تہذیب و تمدن کا ٹھیکہ دار سمجھا جاتا ہے، مگر پیغام محمدی نے کالے، گورے، عجمی، ترکی، تاتاری، زنگی اور فرنگی کا فرق ختم کر دیا حسب و نسب کا کوئی امتیاز نہیں رکھا، یہاں نہ کوئی برہمن ہے نہ شودر، قرآن سب کے ہاتھ میں دیا جائے گا، نماز سب کے پیچھے پڑھی جائے گی، رشتہ ناتا ہر ایک کا ہو سکتا ہے، علم پر ہر ایک کا حق ہے، اور حقوق سب کے یکساں ہیں، خون بھی سب کا برابر ہے۔

آج کل مذہب اور سیاست کو الگ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، ہمارے سیاست داں کہتے ہیں کہ مذہب سے سیاست بگڑ جاتی ہے، مذہبی لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب، سیاست کو نہیں بگاڑتا، بلکہ سیاست مذہب کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے، اس بحث کو چھیڑتے ہوئے سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جس چیز نے سب سے زیادہ گمراہی پھیلائی وہ دین اور دنیا کا فرق ہے، دین کا کام الگ کیا گیا اور دنیا کا کام الگ، خدا کا حکم الگ ٹھہرا دیا گیا اور قیصر کا حکم الگ، دنیا کے حصول کا الگ راستہ بنایا گیا اور دین کے حصول کا الگ، یہ بتا کر سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ یہ سب سے بڑی غلطی تھی جو دنیا میں پھیلی، اس غلطی کا پردہ پیغام محمدیؐ کی نور افگن شعاعوں نے چاک کیا، اس نے بتایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اسی دنیا کے کاموں کو خدا کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق انجام دینا دین ہے، یعنی خدا کے اصول کے مطابق دنیا داری ہی دین داری ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ ذکر و فکر، گوشہ نشینی و عزلت گزینی، کسی غار اور پہاڑ کے کھوہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنا دین داری ہے، اور دوست و احباب، آل و اولاد، ماں باپ، قوم و ملک اور خود اپنی آپ مدد، فکر معاش اور پرورشِ اولاد دنیا داری ہے، اسلام نے اس غلطی کو مٹایا اور بتایا کہ خدا کے حکم کے مطابق ان حقوق اور فرائض کو بخوبی ادا کرنا بھی دینداری ہی ہے۔

ان خطبات کو ختم کرنے سے پہلے سید صاحبؒ نے اس پر زور دیا کہ اسلام میں نجات کا دا

مدار دو چیزوں پر ہے، ایمان اور عمل صالح، خدا پر، نیکی کی راہ بتانے والے پیغمبروں پر، پیغمبروں تک خدا کا پیغام لانے والے فرشتوں پر، ان کتابوں پر جن میں خدا کے پیغام ہیں، اس پیغامِ الٰہی کے مطابق عمل کرنے والوں، عمل نہ کرنے والوں کی جزا و سزا پر یقین رکھنا تو ایمان ہے، لیکن عبادات، معاملات اور اخلاق کی جو تعلیمات پیغام محمدیؐ کے ذریعہ سے ملی ہیں ان کا پابند ہونا عمل ہے، اور اسی میں نجات کا ذریعہ ہے۔

آخر میں سید صاحبؒ کا یہ پیام ہے کہ خاموشی، سکون، خلوت نشینی اور منفردانہ زندگی اسلام نہیں ہے، اسلام جد و جہد، سعی و عمل اور سرگرمی ہے، وہ موت نہیں، حیات ہے، وہ سرتاپا جہاد اور مجاہدہ ہے، لیکن خلوت میں بیٹھ کر نہیں، بلکہ میدان میں نکل کر، اسلام عمل ہے، ترکِ عمل نہیں، ادائے واجبات ہے، عدم واجبات نہیں، ادائے فرض ہے، ترک فرض نہیں، وہ راتوں کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار ہیں، یہی اسلام کی اصل زندگی ہے۔

خطبات مدراس، پر میری یہ خامہ فرسائی طویل ہوگئی ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ اپنی کج بیانی کی وجہ سے اس پر جتنا لکھا جانا چاہیے تھا، پھر بھی نہ لکھا جا سکا، یہ تو وہ کتاب ہے کہ اگر یہ پوری یہاں پر نقل کر دی جائے تو خوش مذاق ناظرین اس کو پڑھنے میں نہ گھبرائیں گے، بلکہ ہر طرح لطف اندوز ہوں گے، اس کی سب سے بڑی خوبی اس کا انداز بیان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ چودہ سو سال کے اندر نہیں لکھا گیا، لیکن جس انداز سے یہ لکھا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس انداز سے اب تک نہیں لکھا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف نے اس کو جھوم جھوم کر اس لیے لکھا ہے کہ لوگ اس کو جھوم جھوم کر پڑھیں، بہت ہی سرشارانہ اور مخمورانہ انداز میں عقیدت کے پھول آستانۂ نبوت پر چڑھائے گئے ہیں لیکن اس سرشاری اور خمار کے ساتھ ایسے منطقیانہ دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں جن کو رد کرنا آسان نہیں، پھر

اس میں نظر و فکر کی ایسی گہرائی بھی ہے جس سے صاف ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر اس میں متکلمانہ رنگ بھی ایسا آگیا ہے جس سے غیر شعوری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نئی کلامی چیزوں سے روشناس ہو رہے ہیں، پرانی باتوں میں نیا پہلو اور نیا زاویۂ نگاہ حاصل ہو رہا ہے، تمام باتوں کے ساتھ اس میں عالمانہ طرز بیان کے ساتھ معلمانہ شان بھی ہے، اس لیے اس کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کوئی نئی باتیں سکھا رہا ہے، اور ہم سیکھنے پر مجبور ہو رہے ہیں، بلکہ ہمارا دامن نئے موتیوں سے بھر رہا ہے، پھر جتنی باتیں لکھی گئی ہیں ان میں زبان، بیان اور طرز ادا کا ایسا زور ہے کہ یہ پوری کتاب انشاء پردازی کا ایک دلآویز گلدان بن گئی ہے، اور یہ پیغمبر علیہ السلام کو نہ صرف سمجھنے اور سمجھانے، بلکہ متشکک ذہن کو صاف کرنے میں برابر مدد دیتی رہے گی۔

اس کتاب پر تبصرہ ختم کرنے سے پہلے بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ اور ایسے چھوٹے بڑے ٹکڑے ہدیۂ ناظرین کیے جائیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے کچھ پہلو جس اچھوتے انداز اور طاقت ور اور جاندار اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں ان سے محظوظ ہوں، ان کو پڑھتے وقت احساس ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و الفت میں سرشار اور مخمور ہو جانے والا سیرت نگار ہی ایسی تحریر لکھ سکتا ہے، پہلے یہ اقتباس پڑھیں:

"عزم، استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا بہ تقدیر، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، استغناء، ایثار، جود، تواضع، خاکساری، مسکنت، غرض نشیب و فراز بلند و پست، تمام اخلاقی پہلوؤں کے لیے جو مختلف انسانوں کی مختلف حالتوں میں، یا انسانوں کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے، مگر وہ کہاں مل سکتی ہے؟ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، حضرت موسیٰ کے پاس ہم کو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ مل سکتا ہے، مگر نرم اخلاق کا نہیں، حضرت عیسیٰ کے ہاں

نرم اخلاق کی بہتات ہے، مگر سرگرم اور خون میں حرکت پیدا کرنے والی قوتوں کا وجود نہیں، انسان کو اس دنیا میں ان دونوں قوتوں کی معتدل حالت میں ضرورت ہے، اور ان دونوں قوتوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف پیغمبر اسلام کے سوانح میں مل سکتی ہیں۔" (ص ۹۲)

اور جس کی ذات مبارک سرور کائنات اور سرکار دوعالم کہلاتی ہے، اس کی زندگی کی مرقع آرائی اس طرح کی گئی ہے:

"جب ہم اس کو شاہ عرب کہہ کر پکارنا چاہتے ہیں، وہ کھجور کی چھال کا تکیہ لگائے کھردری چٹائی پر بیٹھا درویش نظر آتا ہے، عین اس دن جب عرب کے اطراف سے آآکر اس کے سامنے صحن مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا ہے، اس کے گھر میں فاقہ کی تیاری ہو رہی ہے، عین اس عہد میں جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی غلام بنا کر بھیجے جا رہے تھے، فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلعم جا کر اپنے ہاتھوں کے چھالے اور سینہ کے داغ باپ کو دکھاتی ہیں، جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ پر پڑ گئے تھے، عین اس وقت جب آدھا عرب اس کے زیر نگیں ہوتا ہے، حضرت عمرؓ حاضر دربار ہوتے ہیں، ادھر ادھر نظر اٹھا کر کاشانۂ نبوت کے سامان کا جائزہ لیتے ہیں، آپؐ ایک کھری چارپائی یا چٹائی پر آرام فرما رہے ہیں، جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں، ایک کھونٹی میں خشک مشکیزہ لٹک رہا ہے، سرور کائناتؐ کے گھر کی یہ کل کائنات دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑتے ہیں، سبب دریافت ہوتا ہے، عرض کرتے ہیں: یا رسول اللہ! اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا، قیصر و

کسریٰ دنیا کے باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپ، پیغمبر ہو کر اس حالت میں ہیں، ارشاد ہوتا ہے: عمرؓ! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا کے مزے لوٹیں اور ہم آخرت کی سعادت۔" (ص ۱۰۰)

تھوڑی سی سطروں میں سارے انبیاءؑ کی سیرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی جامعیت کا نقشہ جس طرح کھینچا گیا ہے، ایک بار پھر پڑھ کر ہم آپ جس کے پیرو ہیں، اس کی ذات مقدس پر فخر اور ناز کریں، رقم طراز ہیں:

"حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے، حضرت ابراہیمؑ کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے، حضرت موسیٰؑ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے، حضرت عیسیٰؑ کی لائف صرف خاکساری، تواضع، عفو، درگذر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت سلیمانؑ کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے، حضرت ایوبؑ کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونسؑ کی سیرت ندامت، انابت اور اعتراف کی مثال ہے، حضرت یوسفؑ کی زندگی قید و بند میں بھی دعوتِ حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے، حضرت داؤدؑ کی سیرت گریۂ و بکا، حمد، ستائش، دعا، اور زاری کا صحیفہ ہے، حضرت یعقوبؑ کی زندگی امید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو، اس میں نوحؑ و ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ، سلیمانؑ و داؤدؑ، ایوبؑ و یونسؑ، یوسفؑ و یعقوبؑ کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔" (ص ۱۰۲)

اور پھر اسی سلسلہ میں یہ یقین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپؐ کو آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی اطاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاک دامنی اور عیسیٰؑ کا زہد عطا ہوا۔ (ص ۱۰۳)

ایک اور اقتباس پڑھنے کی سعادت حاصل کریں، جس میں عہد رسالت کی ایمان پرور بزم سامنے آجائے گی، اور یہ بزم تحریر کے ذریعہ کیسے سجائی گئی ہے، اس پر بھی نظر رکھیں، لکھتے ہیں:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک انسانی کمالات اور صفاتِ حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی، اور یہ سب آپؐ ہی کی جامعیت کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں، جو کبھی صدیقؓ و فاروقؓ ہو کر چمکتی تھیں، کبھی ذوالنورینؓ و مرتضیٰؓ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں، کبھی خالدؓ اور ابو عبیدہؓ، کبھی سعدؓ و جعفرؓ ہو کر سامنے آتی تھیں، کبھی ابن عمرؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ اور ابو درداءؓ ہو کر مسجد و محراب میں نظر آتی تھیں، کبھی ابن عباسؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور عبد اللہ ابن مسعودؓ کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ اور عقل و حکمت کا دبستان بن جاتی تھیں، کبھی بلالؓ و صہیبؓ اور عمارؓ و خبیبؓ کی امتحان گاہوں میں تسلی کی روح اور تسکین کا پیام بن جاتی تھیں، گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک آفتاب عالمتاب تھا، جس سے اونچے پہاڑ، ریتیلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے، یا ابر باراں تھا جو پہاڑ

اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ، ہر جگہ برستا تھا، اور ہر ٹکڑا اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا، اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے، اور اُگ رہے تھے۔

ایسی تحریروں کے لکھنے پر تعریف و تحسین کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل سکتے، ان ٹکڑوں کو قلمبند کرتے وقت وہ اپنی زبان حال سے کہہ رہے ہوں گے:

مجھے اے ہم نشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں | کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

خطبات مدراس

یہ سید صاحب علیہ الرحمۃ کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمایش اور اس کے سرپرست سیٹھ محمد جمال کی دعوت پر لالی ہال میں اکتوبر و نومبر ۱۹۲۵ء کی مختلف تاریخوں میں انگریزی مدرسوں اور کالجوں کے طالب علموں اور عام مسلمانان مدراس کے مجمع میں دیے، اس میں سیرۃ النبی صلعم کی ساتوں جلدوں کا پورا خلاصہ اور سیرت نبوی صلعم کے تمام پہلو آگئے ہیں، اس کا اندازہ ان خطبات کے حسب ذیل موضوعات سے ہو سکتا ہے، پہلا خطبہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء ع کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، دوسرا خطبہ عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل امت کیلئے صرف محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت ہے، تیسرا خطبہ سیرۃ محمدی صلعم کا تاریخی پہلو، چوتھا خطبہ سیرۃ محمدی صلعم کا تکمیلی پہلو، پانچواں خطبہ سیرۃ محمدی صلعم کی جامعیت، چھٹا خطبہ سیرت محمدی صلعم کی عملیت یا عملی پہلو، ساتواں خطبہ پیغمبر اسلام صلعم کا پیغام قیامت تک کے لیے ہر زمانہ اور دنیا کے ہر ملک ہر قوم اور ہر نسل کے لیے، آٹھواں خطبہ پیغام محمدی صلعم جس میں خدا اور بندہ کے درمیان لطف و محبت اور پیار اور کرم کے تعلقات کی نوعیت پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، جس کو تمام انسانی مخلوق دنیا میں آپ صلعم کی تشریف آوری سے پہلے بھول چکی تھی، یہ خطبات بہت ہی مقبول ہوئے، انگریزی اور دوسری متعدد مقامی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے۔ از مولانا سید سلیمان ندوی رح قیمت گیارہ روپے

وفیات

پیارے امین الدین صاحب!

اٹھ گئیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں | روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جناب شوکت سلطان کی وفات پر دل بے انتہا پژمردہ اور افسردہ تھا کہ دارالمصنفین کے ایک اور انتہائی ہمدرد، مونس اور غم گسار کی رحلت پر آنکھیں پھر اشکبار ہوئیں، اور وہ جناب امین الدین صاحب تھے، وہ کوئی صاحب قلم نہ تھے، شاعر بھی نہ تھے، علی گڈھ کے ام۔ اے۔ ال۔ بی تھے، وکالت شروع کی تو بہت مقبول ہوئے، کچھ دنوں حکومت ہند کے آرڈیننس محکمہ میں بھی ملازم رہے، وہاں سے مستعفی ہو کر آئے۔ تو آنریری مجسٹریٹ ہوئے، پھر ریونیو۔ افسر ہو گئے۔ اور آخر میں شبلی نیشنل کالج میں قانون کے استاد اور اس کے شعبہ کے صدر ہو گئے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد خوش لباس، خوش رہایش، خوش کلام اور خوش باش بن کر بقیہ زندگی گذاری، اور بالآخر ایک طویل علالت کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۸۶ء میں تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

بس یہی ان کی زندگی کی مختصر روداد رہی ہے، مگر انھوں نے سنہ ۱۹۳۰ء سے دارالمصنفین سے جس اخلاص، وضعداری اور محبت سے اپنے تعلقات کا سونا پگھلایا تھا۔ وہ اس ادارہ کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہا،

وہ اس کے کسی قسم کے عہدیدار بھی نہ تھے، اس کی کسی مجلس کے رکن بھی نہ ہوئے لیکن ہر لمحہ اس کے دمساز رہے، وہ اس کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اپنی محبت کے پھول بکھیرتے نظر آتے، اپنی بذلہ سنجیوں، لطیفہ گوئیوں اور شیریں بیانیوں سے ہم میں سے ہر شخص کو شاداں و فرحاں اور یہاں کی مجلس کو زعفران زار کر دیتے، یہاں کی دعوتوں میں شریک ہوتے، تو دسترخوان کو اس کے کھانوں سے زیادہ اپنی گفتار کی شیرینی سے لذیذ تر بنا دیتے، وہ فانی کے بڑے قدرداں رہے، ان کے اشعار کو کبھی برجستہ سنا کر ان کے کلام کی لذت کو دوبالا کر دیتے، مجلس آرائی کے بڑے شوقین رہے، ہر وقت ان کے یہاں ان کے دوستوں اور ملنے والوں کا مجمع رہتا، اور گھنٹوں ان سے ہر محبت اور لطف و لذت کی باتیں کرتے خود بھی محظوظ ہوتے اور دوسروں کو بھی مسرور کرتے، ان کی اہلیہ کی وفات اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ۳۲-۳۳ برس کی رہی ہوگی۔ مگر ان کی یاد میں پوری زندگی گذار دی، ان سے انکے ایک لڑکی تھی، اسی کی پرورش کرتے رہے، اور جب اس کی شادی اپنے ایک بہت ہی لائق اور سعادت مند عزیز جناب اختر انیس سے کر دی، تو ان کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کو کونین کی ساری دولت مل گئی ہے، ان کے داماد بینک کے ایک بڑے عہدہ پر ہو کر لندن میں رہنے لگے، انکی بیگم بھی انکے ساتھ رہنے لگیں جن سے دو بچے ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا، جناب امین الدین صاحب اپنی بیٹی، نواسی اور نواسے سے ملنے لندن بھی جاتے رہے، جب وہاں ہوتے تو انگریزی پوشاک اتنے آداب کے ساتھ پہنتے کہ خود وہاں کے متمول انگریز اتنا اہتمام نہ کرتے ہوں گے، اس کو پہن کر وہ جوان رعنا ہو جاتے، وہ فطری طور پر اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے ملانے میں بہت ہی شائستہ اور مہذب تھے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ اس وقت ہوا جب ان کی اکلوتی پیاری بیٹی کا انتقال لندن میں ہو گیا، پھر ان کا دل جوان کی شگفتہ بیانی کی وجہ سے گلزار بنا رہتا ان کے داغ دل کا لالہ زار بن گیا، اپنی نواسی اور نواسہ اور اپنے انتہائی نیک اور سعید داماد کو دیکھ کر بقیہ زندگی گذارتے رہے،

ان کو اپنے چھوٹے بھائی جناب مبین الدین صاحب سے بھی بڑی محبت رہی، وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے

کے بعد کو اپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار بن کر ریٹائر ہوئے، پنشن پانے کے بعد ان ہی کے ساتھ رہنے لگے، پھر تو دونوں سرخاب کے جوڑے بنے ہر جگہ دکھائی دیتے۔ جناب مبین الدین صاحب کو بھی دار المصنفین سے بڑی محبت رہی، دونوں بھائی یہاں کے ہر قسم کے مسائل کو سلجھانے اور بڑی سے بڑی تقریبات کو انجام دینے میں یہاں کے لوگوں کے ساتھ آخر وقت تک برابر کے شریک رہے، دونوں کی محبت اور یگانگت بھی مشہور رہی، جناب مبین الدین صاحب ۳۱ مئی ۱۹۸۵ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، خود امین الدین صاحب بستر علالت پر تھے، خیال تھا کہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکیں گے، انکے بھتیجے افضال مبین کراچی سے آگئے اور ان کو اپنے ساتھ وہاں لے گئے تاکہ ان کا وہاں علاج بھی ہو سکے، لیکن ان کا وہاں جی نہ لگا۔ اور جلد واپس آگئے۔ اعظم گڈھ سے شاید اپنے مرقد اور مدفن کی تلاش میں اپنے آبائی گاؤں سلطانپور چلے گئے، جہاں کچھ دنوں رہ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اور جب ہم لوگ ان کو سپرد خاک کرنے کے لیے وہاں پہونچے تو ان کی طویل علالت کے بعد ان کی میت کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ

موت کی نیند آگئی بیمار کو　　　غیب سے ساماں شفا ہو گیا

اور جب اپنے مرقد میں لٹائے گئے تو آنسو کے قطرے گر رہے تھے، کہ ایک دیرینہ ہمدم ایک وضعدار دوست۔ ایک مخلص دمساز اور غمگسار ایک عندلیب شیوا بیان اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے ہم آغوش ہو رہا ہے، وہ برابر یاد آتے رہیں گے، اور جب یاد آئیں گے تو محسوس ہوگا کہ ؎

سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

ان کے لیے دل سے دعا ہے کہ ان کی بشری کمزوریوں کو اللہ تعالےٰ اپنے بے پناہ عفو و کرم سے معاف فرمائیں اور ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر نوازیں۔ (آمین) وہ نماز کے بڑے پابند تھے، خوش عقیدہ بھی رہے، بزرگان دین سے محبت کرتے، ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے

اور پھر اپنی زندگی میں جو ایک مثال پیش کی، وہ ہندوستان کے ہندو مسلم دونوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

وہ جب ریونیو افسر تھے، تو ان کے ماتحت ایک اہل کار، ہرنند سنگھ تھے، جو اپنی ایمانداری کے لیے پوری کچہری میں مشہور تھے۔ جناب امین الدین صاحب ان کے کچھ ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی یہ گرویدگی برابر قائم رہی، ان کی ریونیو افسر کی ملازمت ختم ہو گئی تب بھی ہرنند سنگھ ان کی زندگی کے ضروری جزو بنے رہے، ہرنند سنگھ نے اپنی ایمانداری کی وجہ سے ان کی ریونیو افسری کے زمانے میں کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی، پھر بھی اپنی ٹھکرائیت کی آن بان کے ساتھ ان کی ہمدمی کرتے رہے۔ دونوں پنشن پاکر ریٹائر ہوئے۔ تب بھی ایک دوسرے کی وضعداری قائم رہی، ہرنند سنگھ ہر جگہ خصوصاً دفتری اور سرکاری حلقوں میں بڑے مقبول تھے، اس لئے اپنی مقبولیت کی وجہ سے امین الدین صاحب اور ان کے بھائی مبین الدین صاحب کا ہر مشکل کام انجام دے کر ان کو خوش کرتے رہتے، کبھی یہ دونوں بھائی انکی کچھ مالی مدد کرنا چاہتے تو ان کا احسامند ہونا۔ اپنی ٹھکرائیت کی شان کے خلاف سمجھتے، وہ سیاسی حیثیت سے ار۔ اس۔ اس کے کارکن بلکہ مقامی طور پر اس کے رہنما بھی بن گئے تھے، مگر اپنے سیاسی عقیدہ کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا، وہ منظر بڑا ہی سبق آموز ہوتا جب یہ دونوں بھائی طویل علالت میں مبتلا ہوئے، تو ہرنند سنگھ صبح و شام دونوں وقت ان کے یہاں حاضری دیتے اور ان کی ضروریات کو پورا کرتے۔

امین الدین صاحب کی علالت کے آخری دنوں میں ہرنند سنگھ ہی ان کے سارے پسماندہ سرمائے کے امین ہو گئے تھے، بینک میں اپنے نام سے اچھی خاصی رقم رکھ چھوڑی تھی، بینک کے پاس بک میں مشترکہ نام اپنے کسی عزیز کے بجائے ہرنند سنگھ ہی کا رکھوایا، وہی بینک سے ان کے لیے رقمیں نکالا کرتے تھے، اور جب بالکل آخر زمانے میں وہ اپنے گاؤں چلے گئے تو ہرنند سنگھ کو معلوم ہوا کہ ان کی بیماری اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ہر کین ملازمین ان کی تقریباً تین لاکھ کی زمین اپنے نام لکھانا چاہتے ہیں۔ تو ہرنند سنگھ وہاں پہونچ گئے۔ اور سارے کاغذات اپنے قبضہ میں کر لئے اور اعلان کیا کہ تھوڑی سی زمین تو ان ہریجنوں کو دی جا سکتی ہے، بقیہ امین الدین صاحب کے وارثوں کی ہوگی، ان کے اس فیصلہ کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی تھی، وہ کچھ ایسے مقبول اور بااثر تھے کہ سرکاری حکام بھی وہی کرتے جو وہ چاہتے۔ اور جب امین الدین صاحب سپرد خاک کر دیے گئے تو اسی وقت ہرنند سنگھ ان کے دوستوں اور عزیزوں سے کہہ رہے تھے، کہ بینک میں جو ان کی رقم ہے، وہ ان کی وصیت کے مطابق کچھ تو خیرات کی جائے گی۔ اور بقیہ ان کو دی جائے گی۔ جن کے لیے وہ کہہ گئے ہیں، یہ سن کر جو آنکھیں امین الدین صاحب کی موت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ وہی آنکھیں ان کے گاؤں کے بنگلہ کی فضا میں ہرنند سنگھ کی وفاداری، دیانت داری، تعلقات کی وضعداری، اور مہر و محبت کی پاسداری کا پرچم لہراتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ اور یہی فضا زبان حال سے یہ بھی کہہ رہی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ہر ہندو ہرنند سنگھ، اور ہر مسلمان ہندوؤں کے لئے امین الدین ہو جائے۔ تو اس کی دھرتی پر باہمی مہر و محبت کی گنگا اور اعتماد و اخلاص کی جمنا بہتی دکھائی دے۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

بزم رفتگاں

یہ اڈیٹر معارف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانش وروں، ادیبوں، مصنفوں، شاعروں، اور سیاسی و قومی و ملی رہ نماؤں کی وفات پر نہایت درد انگیز تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، اس کے دو حصے ہیں، حصہ اوّل مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ قیمت: ستر روپیے حصہ۔ دوم۔ مطبوعہ معارف پریس دار المصنفین اعظم گڈھ۔

از۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

مکتوب پیرس

۵ جنوری ۱۹۸۶ء

مخدوم ومحترم مدفیضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام ستمبر ۱۹۸۵ء کا معارف ملا۔ رات کو ورق گردانی کی، سب ہی مضامین دلچسپ ہیں۔ بارک اللہ۔

(۱) دراقت کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، احتیاطاً ایک چیز کا ذکر کرتا ہوں۔ گوٹن برگ (فوت ۱۴۶۸ء) فنِ طباعت کا موجد مانا جاتا ہے۔ حال میں مجھے پتہ چلا کہ ویانا (اسٹریا) کے کتب خانۂ عام میں ایک ٹکڑا قرآن مجید کا موجود ہے۔ جو گوٹن برگ سے پانچ سو سال قبل سلجوقی دور میں (غالباً مصر میں) چھپا ہے۔ اور یہ تاریخ فرنگی محققوں نے بیان کی ہے۔ اسٹریا کو فوراً خط لکھ کر اس کا فوٹو منگایا۔ واقعی قابلِ دید اور قابلِ ذکر چیز ہے۔ میں اسے اپنے فرانسیسی مقالے "تاریخ خطِ عربی" میں چھاپ بھی رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔

(۲) یہ سب جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے واپسی پر رسول اکرمؐ نے ہمسایہ سلاطین کو تبلیغی خط لکھے، یہ ۶ھ کے اواخر کا واقعہ ہے، اس میں دو نکتوں پر توجہ دلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(الف) اس پر سالِ رواں میں ۱۴۰۰ سال گزر رہے ہیں۔

(ب) رسول اکرمؐ نے یہ ایک وقت تین براعظموں پر اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وسعت دی، یورپی حکمران ہرقل، ایشائی حکمران کسریٰ پرویز اور افریقی حکمران اصحمہ نجاشی کو خط لکھے۔

(۳) شاید یہی کہ صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے فتح مبین اور نصر عزیز کا نام دیا ہے، حضرت عمرؓ جیسا فرد بھی اسوقت اس کو سمجھ نہ سکا اور رسول اللہؐ سے جاکر تشویش سے پوچھا تھا۔ یہ اہانت آمیز صلح کیوں؟ حضورؐ نے راز کو فاش کرنا نہ چاہا، امام شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر میں اسکا راز بتایا ہے کہ یہ خیبر کی مجوزہ مہم کے وقت قریش کی غیر جانبداری و ناطرفداری کے حصول کے لئے تھا۔

نیازمند - محمد حمید اللہ

مطبوعات جدیدہ

اسلام اور موسیقی:- از مولانا مفتی محمد شفیعؒ۔ مترجمہ مولوی محمد عبد المعز صاحب متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۴۴، قیمت ۴۰ روپیے، پتہ: مکتبۃ الفلاح، دیوبند، یوپی۔

مکتبۃ الفلاح دیوبند نیا ہونے کے باوجود بڑے اہتمام اور نفاست سے مفید دینی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ نفائس العارفین کا ذکر ان صفحات میں پہلے آچکا ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی مکتبہ نے موجودہ طباعتی معیار کے مطابق شائع کی ہے، یہ دراصل پاکستان کے سابق مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب کی ایک عربی تصنیف کشف العناء عن وصف الغناء کا اردو ترجمہ ہے، اس میں مصنف نے موسیقی کی شرعی حیثیت پر عالمانہ بحث کی ہے، اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے احکام، فقہا کے اقوال، صوفیہ کے ارشادات اور امت کے تعامل کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے پہلے باب میں موسیقی وغنا کی حرمت پر دلالت کرنے والی آیتیں، حدیثیں اور صحابہ وسلف صالحین کی رائیں تحریر کی ہیں۔ دوسرے باب میں ان آیات واحادیث اور آثار واقوال کو جمع کیا ہے جن سے موسیقی کی حلت واباحت ثابت ہوتی ہے، تیسرے باب میں دونوں قسم کی روایتوں میں جمع وتطبیق کی دو صورتیں بیان کرکے ان کے تعارض کو دفع کیا ہے، اور ثابت کیا ہے، کہ معازف ومزامیر تو سراسر حرام ہیں لیکن کچھ صورتوں اور بعض موقعوں پر غنا وملاہی جائز ہیں، مصنف نے ان صورتوں اور موقعوں کی وضاحت بھی کی ہے، اس کے بعد فقہ اسلامی کے چاروں مذاہب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی نیز مستند صوفیہ کرام کے حوالہ سے اس مسئلہ کی مزید تنقیح کی ہے، اور دکھایا ہے، کہ موسیقی اور غنا کو علی الاطلاق کسی نے بھی جائز نہیں بتایا ہے، آخری باب میں ائمہ اربعہ صوفیہ ومشائخ کے اقوال کا خلاصہ پیش کرکے

بتایا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک غنا کی کون سی قسم حرام، کون سی مباح اور کون سی مختلف فیہ ہے، اسی طرح سماع اور قوالی کی اباحت کے شرائط اور غنا کے بارہ میں اختلافات کی بنیاد بھی بتائی ہے، اور آخر میں زیر بحث مسئلہ میں احتیاط و اعتدال کا جو مقتضیٰ ہے اسے پیش کیا ہے، اس طرح موسیقی کے متعلق کتاب و سنت اور سلف صالحین سے جو کچھ منقول اور ثابت ہے اسے پوری تفصیل و تحقیق سے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، جس سے اس کے بارہ میں اصل اسلامی نقطۂ نظر واضح اور معلوم ہو جاتا ہے، اس کے مترجم مولانا عبد المعز صاحب استاد و رکن دار التصنیف دار العلوم کراچی نے شروع میں ایک طویل مقدمہ اور آخر میں اس کا تکملہ لکھا ہے جو مفید اور پُر از معلومات ہے، ان کے قلم سے جا بجا حواشی بھی ہیں، جن میں روایات کی تخریج اور ان کی صحت، قوت یا ضعف و سقم کی صراحت، متن کے مجمل اور توضیح طلب امور کی تشریح کی ہے، اس سے اس کتاب کا علمی پایہ بڑھ گیا ہے، مگر ان کی تحریر میں کہیں کہیں تکرار، طوالت اور غیر ضروری تفصیل بھی ہے، مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے "خدا کے حکم کو بے چون و چرا مان لینا اور اس پر عمل کرنا مسلمان کا فرض ہے"۔ یہ بالکل صحیح ہے، لیکن اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے، کہ خدا کے حکم میں حکمتیں تلاش کرنا ضعف ایمانی کی دلیل ہے، ..... علم اسرار و حکم قرون اولیٰ میں ناپید تھا (ص ۵۶) یہ بات صحیح نہیں ہے، خدا کے حکم میں نیک نیتی سے اس کی حکمتیں معلوم کرنا معیوب نہیں ہے، خود مقدمہ نگار نے بھی بعض چیزوں اور سرود و موسیقی کی ممانعت کی حکمت بیان کی ہے، بعض صحابۂ کرام اور سلف صالحین سے بھی بعض چیزوں کی حکمتیں منقول ہیں اور قرآن و حدیث میں بھی متعدد احکام کی حکمتیں مذکور ہیں، مکتبہ الفلاح نے اس پاکستانی کتاب کو شائع کر کے ہندوستان والوں کے لئے بھی اسے سہل الحصول بنا دیا ہے۔

شمائل رسول صلی اللہ علیہ وسلم :- مترجم جناب محمد میاں صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۲، قیمت ۲۸ روپیے۔ پتہ مکتبۃ الفلاح، دیوبند (یو۔ پی)

یہ کتاب بھی مکتبہ الفلاح نے شائع کی ہے، جو چودھویں صدی ہجری کے اوائل کے ایک فلسطینی عالم اور

کثیر التصانیف بزرگ کی عربی کتاب وسائل الوصول الی شمائل الرسول کا اردو ترجمہ ہے، اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا بیان کیا گیا ہے، پہلے آپ کے نسب، اسمائے مبارکہ اور حلیہ شریف کا ذکر ہے، پھر آپ کے ملبوسات، اسلحے، کھانے پینے اور سونے کے معمولات اور عبادات و اذکار تحریر کیے گئے ہیں، اور سیرت و اخلاق کے جلوؤں کی جھلک دکھائی گئی ہے، آخر میں علالت، وفات اور عام زندگی کے بعض حالات و واقعات کا مرقع پیش کیا ہے، شمائل نبوی پر عربی میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں امام ترمذیؒ کی کتاب زیادہ مشہور و مقبول ہے، جس کے اردو ترجمے ہو چکے ہیں، زیر نظر کتاب امام ترمذیؒ کے علاوہ دوسری کتب سیر و شمائل کو بھی پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، اور یہ مفید اور جامع ہے۔ مگر ضعیف روایات سے خالی نہیں، پہلی کتاب کی طرح اس کی قیمت بھی زیادہ ہے۔

اضواء علی تاریخ الحرکۃ العلمیۃ والمعاھد الاسلامیۃ والعربیۃ فی گجرات } مرتبہ مولوی عبد اللہ سورتی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۱۲۸، قیمت تحریر نہیں۔ ناشر مطبعۃ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ الہند۔

اس عربی کتاب میں گجرات کی گذشتہ اور موجودہ علمی و دینی سرگرمیوں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے، اور یہاں کی علمی شخصیتوں اور دینی مدارس کا اجمالی تذکرہ و تعارف ہے، اس سلسلہ میں پہلے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت، صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی یہاں تشریف آوری اور قدیم زمانہ سے گجرات کے عربوں سے تعلقات دکھائے گئے ہیں، پھر گجرات کے مسلم سلاطین، وہاں آنے والے اصحاب علم اور خود گجرات کے محدثین کا مختصر ذکر ہے، ایک باب میں گجرات کے قدیم اور ایک باب میں جدید دینی مدارس کی خدمات بیان کی گئی ہیں۔ اور ان کا نصاب تعلیم بھی دیا گیا ہے، مصنف نے ملک و بیرون ملک میں گجرات کے علما کی تبلیغی اور تعلیمی خدمات بھی پیش کی ہیں اور ان کی تصنیفات کی فہرست بھی دی ہے۔ ایک باب میں گجراتی زبان پر عربی کے اثرات دکھائے ہیں، آخر میں وہاں کے دینی رسائل و جرائد کا ذکر ہے، حکیم مولانا سید عبد الحی

سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے گجرات کے علمی کارناموں اور وہاں کے فضلاء کے بارہ میں اپنی کتابوں میں مختلف مضامین جمع کر دیے ہیں، مصنف نے انہی کتابوں کی مدد سے گجرات کی علمی، تعلیمی اور دینی خدمات کا یہ مرقع سلیقہ سے ترتیب دیا ہے، مگر یہ کتاب مزید محنت و کاوش اور تفصیل کی متقاضی تھی تاکہ آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے یہ اچھا ماخذ بھی بن جاتی۔

نفقۂ مطلقہ کے بارے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ — مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰، قیمت ۳ روپیہ، پتہ یو۔ پی۔ ایکشن کمیٹی مسلم پرسنل لا بورڈ۔ ندوۃ العلماء۔ پوسٹ بکس ۹۳۔ لکھنؤ۔

مطلقہ عورت کے نفقہ کے متعلق سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کے تمام طبقوں میں شدید ردعمل پایا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر برابر مضامین اور کتابچے لکھے جا رہے ہیں، یہ رسالہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں فیصلہ کے نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کر کے اس کے دور رس اثرات و خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے، اور کتاب و سنت اور کتب فقہ کی روشنی میں اس واقعی شرعی حکم بیان کر کے اس کی مختلف حکمتیں اور مصلحتیں بتائی گئی ہیں، اس طرح نفقہ کے اصل حکم کے بارہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ رفع کر دی گئی ہیں، لائق مصنف نے حکومت کے ایک نوجوان وزیر کی اس تقریر کا جائزہ بھی لیا ہے، جو عدالتی فیصلہ کی تائید میں پارلیمنٹ میں کی گئی تھی، اس سے اس کی بے بنیاد باتوں اور غلط حوالوں کی تردید ہو گئی ہے۔ آخر میں متاع طلاق کے بارے میں ایک مفید بحث بھی شامل ہے، یہ رسالہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سنجیدہ اور علمی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جو لائق مطالعہ ہے۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اوّل اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری و حق دوستی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں قیمت ۱۴ روپے،

جلد دوم۔ اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں، شیر شاہ، اسلام شاہ پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر و شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں قیمت ۳۴ روپے،

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت:۔ ۳۰ روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری:۔ اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات، اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا اسوہ پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

"مرتبہ"

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

جلد ۱۳۷ ماہ رجب المرجب و شعبان المعظم ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۶ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ